اسلامی قانونِ محنت و اُجرت

تالیف

مولانا مجیب اللہ ندوی

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
نسبت روڈ ○ لاہور

سلسلہ مطبوعات مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری۔

اسلامی قانونِ محنت و اُجرت

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور

تالیف
مولانا مجیب اللہ ندوی

شائع کردہ

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
نسبت روڈ ○ لاہور

نام کتاب : — اسلامی قانون محنت واجرت

مصنفہ : — مولانا مجیب اللہ ندوی

شائع کردہ : — مرکز تحقیق (ریسرچ سیل) دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

لاہور پاکستان

طابع — میاں عبدالماجد

باہتمام — محمد سعید مینجر

امپرنٹ آفسٹ پرنٹرز

۸۔ ایبٹ روڈ لاہور فون :۔ ۲۲۴۳۶۵

قیمت =/۵ ۴ روپے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

جاگیرداری نظام کی شکست و ریخت کے بعد جب جاگیرداروں نے یہ محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دنوں تک اپنے ملک کے غریب عوام کے کاندھوں پر اپنی غلامی کے جوئے کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ تو انہوں نے چولا بدلا اور اونے پونے اپنی زمینیں فروخت کر کے سرمایہ اکٹھا کیا اور کارخانے قائم کرنا شروع کیے غرض کہ دنیا مشینی دور میں داخل ہو گئی۔ وہی سرمایہ دار جو پہلے جاگیردار تھا اب کارخانہ دار بن گیا اور وہ مزارع جو پہلے کھیتوں میں محنت و مشقت کر کے جاگیردار کے حریصانہ جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا کرتا تھا اب مل مزدور کے روپ میں کارخانوں میں تھا وہ دیو استبداد جو پہلے زمینوں پہ جاگیردار کے روپ میں حکمرانی کر رہا تھا اب اپنی تمام طبعی خاصیتوں کے ساتھ کارخانوں کے ایئرکنڈیشنڈ دفاتر میں براجمان تھا وہی استحصال، وہی معاشی جبر، وہی حق تلفی اور ظلم و جور۔ پہلے اس کا نشانہ مزارع تھا اور اب مل مزدور۔

اس کا ردِ عمل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ نظریات کی دنیا میں سوشلزم در آیا ہر چیز کو قومیانے، دولت کی مساویانہ تقسیم اور محنت کشوں کی حکمرانی کے سنہری خواب دکھائے گئے لیکن نتیجہ کیا نکلا وہی ڈھاک کے تین پات۔ یقین نہ آئے تو ہنگری، پولینڈ، چیکوسلاویکیہ والوں سے پوچھیئے یا پھر بے زبان روسی عوام کی گرد آلود پیشانیوں پر مرقوم ظلم کی داستانوں کو پڑھنے کی کوشش کیجئے۔ ظلم سرمایہ دارانہ نظام میں تھا اور اشتراکی و اشتمالی نظام میں بھی ہے۔

غریب دونوں جگہ مظلوم، مقہور اور پسماندہ ہے۔ دین و مذہب، روحانیت و شرف

اخلاق، شخصی واجتماعی آزادی، حریت فکر، حریت اجتماع، حریت عمل، سب کچھ کھو دینے کے بعد اگر دو وقت کی روٹی میسر آ بھی گئی تو کیا ہوا۔

آج دنیا کے غریب محنت کش عوام سرمایہ داری اور اشتراکیت کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں۔ اور دنیا کے عظیم مفکر حیران و پریشان ہیں کہ اس مشکل کا کیا حل ہے۔ راہ سجھائی نہیں دیتی، پیچیدگی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اُمت مرحومہ جسے قرآن نے "خَيْرَ اُمَّةٍ" کا لقب دیا ہے اور دنیا کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری سونپی ہے، آگے آئے اور غریب محنت کش طبقے کو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ وہ عادلانہ معاشی نظام بخشے جو ہر درد کی دوا اور ہر عقدۂ لاینحل کے لیے ناخن تدبیر ہے۔

زیر نظر کتاب "اسلامی قانون محنت و اُجرت" اسی جہت میں ایک کوشش ہے محنت کی عظمت، محنت کش طبقے کی بہبود، اس کے مسائل کا قرآن و سنت کی روشنی میں حل اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، فقہائے امت کے استنباطات اور ان کو نافذ کرنے کے طریقوں پر اس کتاب میں بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کتاب سے پہلے اس موضوع پر دنیا کی معروف زبانوں میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے اور یہ پہلی کتاب ہے۔ اس وقت جبکہ ملک میں نفاذِ شریعت کا عمل جاری ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ارکان حکومت کے لیے بالخصوص اور محنت کش طبقات کے لیے بالعموم یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہوگی۔ چونکہ اس کتاب کے کچھ حصے پچیس سال قبل ہندوستان کے تناظر میں لکھے گئے تھے۔ اس لیے ہم نے جناب پروفیسر ڈاکٹر **نور محمد غفاری صاحب** اسلام آباد سے اس کے مسودے پر نظر ثانی کرائی ہے اور امثال و نظائر کو چھوڑ کر اسے پاکستانی حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے چند مقامات پر نہایت ادب و احترام سے اختلافی حواشی

بھی لکھے ہیں تاہم کم سے کم تبدیلی کی گئی ہے۔ اس لیے کہ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب اطال اللہ بقاءہٗ کی شخصیت معمولی شخصیت نہیں ہے اور نہ محتاج تعارف۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد خوش قسمتی سے مولانا موصوف کو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی (بھارت) میں کام کرنے کا موقع ملا اور جلد ہی آپ کے علمی و تحقیقی مقالات اور بلند پایہ تصانیف کی وجہ سے آپ کا شمار برصغیر کے نامور علماء اور اصحاب قلم میں ہونے لگا اس وقت بھی مولانا موصوف اعظم گڑھ میں واقع ایک عظیم دینی درسگاہ جامعۃ الرشاد کے ناظم اعلیٰ ہیں اور بحمد اللہ ان کا قلم بھی رواں ہے۔ انشاء اللہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہماری طرح قارئین کرام بھی مولانا موصوف کے تبحر علمی کے قائل ہو جائیں گے۔

مرکز تحقیق ریسرچ سیل دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کو یہ شرف حاصل ہے کہ اکثر و بیشتر مولانا موصوف کے رشحات قلم سے پاکستانی قارئین کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتا رہتا ہے۔ اور راقم الحروف سے مولانا نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اپنی کتب اور مقالات کی اشاعت کے سلسلے میں مرکز تحقیق کو ترجیح دیتے رہیں گے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب کو عمر دراز عطا فرمائیے تاکہ برصغیر کے مسلم عوام کو زیادہ سے زیادہ ان سے علمی استفادے کا موقع مل سکے۔ آمین۔

آخر میں میں جناب پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی کرنے میں ادارہ کے ساتھ گراں قدر علمی تعاون فرمایا ہے۔

سید محمد متین ہاشمی
ڈائریکٹر ریسرچ سیل دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

موجودہ دَور میں معاشیات نے انسانی زندگی میں جو اہمیت حاصل کرلی ہے اس سے ہر آدمی واقف ہے، حتیٰ کہ دنیا کی کئی حکومتیں معاشیات کو جزء زندگی نہیں بلکہ کل زندگی بنا کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کررہی ہیں، اس لئے جب ہم اسلامی نظام کو بروئے کار لانے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں بہرحال موجودہ دَور کے حقیقی یا مصنوعی معاشی مسائل پر بحث کرنا ضروری ہوتا ہے اور پھر اس سلسلہ میں اسلام نے جو اصولی ہدایات دی ہیں ان کی قانونی واخلاقی حیثیت کو اس طرح پیش کرنا ضروری ہوجاتا ہے جس سے اسلامی معاشیات کا تصوّر عام لوگوں کے ذہن نشین ہوسکے، موجودہ دور کے معاشی نظام میں جو مسائل انتہائی اہم ہوتے ہوئے بھی پورے طور پر ان کا کوئی پائدار حل ابھی تک تلاش نہیں کیا جاسکا ہے ان میں ایک مزدوروں کی اُجرت کا مسئلہ بھی ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ موجودہ معاشیات کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ کا محض سطحی نہیں بلکہ تحقیقی حیثیت سے اسلامی حل پیش کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن وسنّت کے ساتھ ہمارے بزرگوں نے فقہ اسلامی کا جو وسیع ذخیرہ چھوڑا ہے اس میں ان تمام مسائل کا اصولی طور پر ذکر موجود ہے، مگر متفرق طور پر۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم متفرق جگہ سے ان جواہر ریزوں کو جمع کرکے ایک لڑی میں پرودیں اور ان کو ایک مربوط نظام کی طرح دنیا کے سامنے پیش کریں، راقم الحروف نے آج سے بیس برس پہلے اسلامی معاشیات کے کچھ پہلوؤں پر دارالمصنفین کے تعلق کے زمانے میں کام کرنا شروع کیا تھا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی "اسلامی قانون اُجرت و محنت" اور "اسلامی قانون

تجارت" ہے اسلامی قانون تجارت کا کام تو ابھی تک نامکمل ہے، مگر اسلامی قانون محنت و اجرت کے بشیتر ابواب اسی وقت مرتب ہو گئے تھے اور اس کے کچھ حصے متفرق پرچوں میں شائع بھی ہوئے، مگر اب اسے مزید اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں اشاعت کے لیے دیا جا رہا ہے، اس کا آخری باب "بے روزگاری کا مسئلہ اور اس کا حل اسلامی نقطہ نظر سے" جو صرف مزدوروں تک محدود نہیں ہے، مگر چونکہ ہر ملک کی بڑی آبادی مزدوروں کی ہوتی ہے، اس لیے اس میں اسے شامل کرنا ضروری ہوا۔ (اسی ضمن میں اسلامی حکومت کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اس کی تفصیل بھی آ گئی ہے)

اس کتاب میں بہت سی مثالیں اور اعداد شمار آج سے پچیس برس پہلے کے ہیں مگر جن جن گوشوں کو واضح کرنے کے لیے یہ مثالیں اور اعداد شمار پیش کئے گئے ہیں ان میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے، اس لیے اسے جوں کا توں باقی رکھا گیا ہے، اور کچھ نئی مثالیں بھی دیدی گئی ہیں، مثلاً مزدوروں کی ریلوے اسٹرائک، امریکہ اور برطانیہ اور ہندوستان کی اسٹرائیکوں کے جو تاریخ ۱۹۵۶ء اور اس کے لگ بھگ پیش آئے تھے، اس میں اور ہندوستان کی ۱۹۷۴ء کی ریلوے اسٹرائک اور مختلف اسٹرائکوں اور ۷۸-۱۹۷۷ء کی کپڑا مل اور اساتذہ کی اسٹرائکوں کے درمیان بہت کم فرق دکھائی دے گا۔ "اسلامی قانون محنت و اجرت" کے نام سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں اس سلسلہ کی ساری قانونی دفعات نقل کر دی گئی ہیں، بلکہ اس میں کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی انہی اصولی ہدایات کی روشنی میں اجرت کی تعیین اور اجیر و متاجر کے حدود و اختیارات اور ان کے فرائض اور حقوق کے لیے قوانین (ACTS) بنائے جا سکتے ہیں۔

فقہاء اجیر و متاجر کے حقوق و اختیارات اور فرائض کا ذکر کتاب الاجارۃ اور بیع الاستصناع کے تحت کرتے ہیں اور کتاب الاجارۃ اور بیع الاستصناع میں تین طرح کے اجیروں اور مزدوروں کا ذکر ہوتا ہے، ایک اجیر خاص یعنی وہ مزدور جو دوسروں کا کام

اجرت پر کرتے ہیں اور خود جاکر اپنا کام ڈھونڈتے اور کرتے ہیں۔ ایسے مزدور ایک مدت مقررہ ایک دن یا ایک ماہ یا ایک سال کے لیے مزدوری پر لگائے جاتے ہیں۔ دوسرے اجیر مشترک اس سے پیشہ ور کاریگر مراد ہیں، مثلاً درزی، بڑھئی، لوہار، سنار اور رنگریز وغیرہ جن کے یہاں جاکر یا ان کو بلاکر کام لیا جاتا ہے وہ کام کے لیے خود نہیں جاتے تیسرے کرایہ پر کسی چیز کے لینے دینے یا اس کو کسی خاص جگہ پہنچانے کا ذکر بھی اسی کتاب الاجارہ میں ہوتا ہے

اس کتاب میں اصلاً تو ذکر اجیر خاص یعنی مقررہ اجرت پر مقررہ مدت کے لیے کام کرنے والے مزدوروں کا ہے، مگر ضمناً دوسرے پہلوؤں کی کچھ تفصیل اس میں کردی گئی ہے، جانوروں سے چونکہ پہلے سواری کے ساتھ بار برداری کا کام بھی لیا جاتا تھا اس لیے فقہاء زیادہ تر اسی پہلو سے گفتگو کرتے ہیں مگر اس میں بڑی وسعت ہے، اب ریل، جہاز اور ہوائی جہاز کی بار برداری کو بھی اسی پر قیاس کرکے اس کے لیے قوانین وضع کیے جاسکتے ہیں۔ مگر اس تیسری قسم کے احکام کے سلسلہ میں کفالت، حوالہ اور ودیعت وامانت کے ابواب سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔

راقم الحروف کے علم میں "اسلامی قانون اجرت و محنت" کے موضوع پر کسی بھی زبان میں اب تک بحیثیت موضوع اتنی تفصیل سے کوئی چیز نہیں لکھی گئی ہے اس لیے اس نقش اول میں غلطی کے بہت امکانات ہیں، ناظرین جہاں کوئی فنی یا استدلال کی غلطی محسوس کریں احقر کو مطلع فرمادیں، انشاء اللہ دوبارہ اشاعت میں اس کی تصحیح کردی جائے گی۔

اس کتاب کے کچھ حصے "معارف" اعظم گڑھ اور "زندگی" رام پور میں بیس پچیس برس پہلے شائع ہوئے تھے، جتنا حصہ معارف اور زندگی میں شائع ہوا تھا اسے کالی کٹ کے ایک ناشر نے ملیالم زبان میں ترجمہ کرکے آج سے بیس برس پہلے شائع کردیا تھا، مگر وہ نامکمل چیز تھی، اب پہلی بار نظر ثانی کے بعد مکمل صورت میں یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔

میں اس سلسلہ میں جناب مولانا سید متین ہاشمی صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کی کوششوں سے پاکستان میں یہ کتاب مکمل صورت میں ناظرین کے ہاتھوں میں جا رہی ہے، موصوف کی ہمت افزائی شامل حال رہی تو راقم الحروف کی اور بہت سی وہ علمی کاوشیں، انشاء اللہ ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں گے جو وسائل کی کمی کی وجہ سے برسوں سے سرد خانہ میں پڑی ہوئی تھیں، اس طرح راقم الحروف کی بہت سی علمی محنتیں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی، میں مولانا سید محمد متین صاحب کے علاوہ عزیزی ڈاکٹر مشیر الحق جامعہ ملیہ نئی دلی اور کبیر احمد جائسی اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کا بھی ممنون ہوں کہ ان لوگوں کے بار بار ابھارنے اور آمادہ کرنے پر لکھنے پڑھنے کی جو تھوڑی بہت صلاحیت ہے اسے ایک مدت کے بعد بروئے کار لانے کی کوشش کر سکا ہوں۔

راقم الحروف کے اس جذبہ احسان و تشکر کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس بات سے واقف ہیں کہ کچھ محترم حضرات کی کرم فرمائیوں سے برسوں میرا قلم ٹوٹا پڑا رہا ذہنی الجھنوں کی وجہ سے نہ میں پچھلے علمی کاموں پر نظر ثانی کر سکا اور نہ کوئی نیا علمی کام کر سکا مگر خدائے قدوس کی مدد اور مذکورہ بالا دوستوں اور عزیزوں کی ہمت افزائی سے دوبارہ اس ٹوٹے ہوئے قلم پر نیا قط لگا کر اسے رواں کرنے کی ہمت کر سکا ہوں۔

راقم الحروف کی دو کتابیں دار المصنفین سے شائع ہو چکی ہیں اور دو مکتبہ جامعہ سے اور چند کتابیں مکتبہ جامعۃ الرشاد سے، مولانا سید متین صاحب کی عنایت سے پہلی بار پاکستان میں جو دو تین کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں "اسلامی قانون محنت و اجرت" بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس محنت کو مفید بنائے اور جو حضرات اس میں معین ہوئے ہیں ان کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عنایت کرے۔

چند اصطلاحیں

کتاب میں چند فقہی اور معاشی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جن کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

۱۔ اجرت: مزدور کی جسمانی یا دماغی محنت کے بدلہ میں جو رقم یا جو چیز دی جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) اجرت صحیحہ، جو مزدور کی ضروریات کے مطابق دی جائے۔

(۲) اجرت متعارفہ یا اجرت مثل وہ اجرت جو حکومت مقرر کرے یا جو ملک کے عام کارخانوں وغیرہ میں مزدور پاتے ہوں۔

۲۔ اجیر محنت کرنے والا مزدور۔

۳۔ مستاجر یا آجر۔ کام لینے والا یا کارخانہ دار۔

۴۔ اجیر خاص مزدور اور اجیر مشترک پیشہ ور افراد جیسے سنار، لوہار، بڑھئی، دھوبی وغیرہ

۵۔ جانور یا جن چیزوں (مثلاً ریل جہاز وغیرہ) سے بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اگر وہ کرایہ پر استعمال کئے جائیں تو ان کا حکم بھی اجیر مشترک ہی کا ہوگا، اس کی طرف اس میں اشارہ ملے گا، تفصیل کے لیے اسلامی قانون تجارت کا انتظار کیا جائے۔

خادم

مجیب اللہ ندوی

جامعۃ الرشاد، رشاد نگر، اعظم گڑھ

۱۶ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء

باب اوّل

بیروزگاروں اور مزدوروں کے سلسلہ میں معاشرہ اور حکومت کی ذمّہ داریاں

آجر اور مزدور کا جھگڑا حل کرنے کی کوششیں

اجرت، اجیر اور مستاجر کے مسائل کے لیے دنیا کے موجودہ اقتصادی نظاموں نے جو کوششیں کی ہیں اور کر رہی ہے۔ اگر ان کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ آجر اور اجیر یا محنت اور سرمایہ کے تنازعہ (Labour Capital Conflict.) کو حل کرنے میں یکسر ناکام رہی ہے۔ اگر نظام سرمایہ داری نے سرمایہ دار کو تحفظ فراہم کیا ہے اور مزدور کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے تو اشتراکیت نے اپنا سارا زور مزدور کی فلاح پر خرچ کرنا چاہا ہے مگر دونوں کو کتنی کامیابی ہوئی ہے وہ ہر اس شخص پر واضح ہے جس کا معاشیات سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ۔ جو نظام سرمایہ داری کے پیامبر ہیں۔ دونوں نے سرمایہ اور محنت میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لیے اب تک کئی قوانین بنائے اور توڑے ہیں۔ مگر نہ مزدور مطمئن ہے نہ سرمایہ دار خوش سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں کو اپنے مطالبات منوانے کے لیے ٹریڈ یونین (Trade Union.) قائم کرنے کی اجازت دی ہے جو جب کبھی سرمایہ دار کو سزا دینا چاہتی ہیں مزدوروں کی ہڑتال (Strike.) کرا دیتی ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ داروں (مل مالکان وغیرہ) کو تالہ بندی کی اجازت دیدی۔ وہ جب مزدور کو اپنے حقوق کے جدوجہد کرتا دیکھتے ہیں تو تالہ بندی (Lock-out.)

کر دیتے ہیں۔

نتائج ظاہر ہیں اشیاء صرف کی پیداوار میں کمی، ان کی قیمتوں میں اضافہ اور نتیجتہً پوری قوم کا استحصال وغیرہ دوسری طرف مزدوروں کی بے روزگاری اور ان کی پریشانیوں میں اضافہ گو سرمایہ دارانہ نظام اس کا دعویدار ہے کہ اس نے سرمایہ اور محنت کا تنازعہ حل کر دیا ہے مگر آئے دن کی ہڑتالیں اور تالہ بندی اس کی ناکامی کا بیّن ثبوت ہیں۔

اب اشتراکیت کو لیجیئے۔ اس نے اپنے ہتھوڑے کے ایک ہی وار سے سرمایہ دار کو موت کی نیند سلا دیا ہے اور اپنی درانتی سے مزدور کی رگِ حس اور عقل کاٹ دی ہے۔ لہٰذا اب حکومت ہی سرمایہ دار ہے اور مزدور اس کے لیے مشین کا ایک بے حس پرزہ، جسے صرف اس لیے تیل دیا جاتا ہے کہ وہ کام کرتا رہے۔ لہٰذا آجر مزدور جھگڑا حل کرنے کا اس نے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیئے؟

ان دونوں کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے آسمان سے نازل شدہ ہدایات کو چھوڑ کر انسانی عقل پر بھروسہ کیا ہے۔

محنت۔ سرمایہ تنازعہ کا اصل سبب

محنت اور سرمایہ کے موجودہ تنازعہ کی آپ جتنی وجوہات گن لیں۔ ان کی شاہ کلید "اجرت"، ہی ہوگی۔ سرمایہ دار اپنا نفع زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کیلئے چاہتا ہے کہ وہ مزدور سے زیادہ کام لے اور اُجرت کم دے اور آج کا مزدور یہ چاہتا ہے کہ کام تھوڑا کرے اور اجرت زیادہ لے۔ اس دونوں طرف کی غلط سوچ نے ایک جھگڑے کو جنم دیا ہے جس نے کئی بار ساری دنیا کا امن تباہ کیا ہے اور آئندہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا حل" عادلانہ اجرت کے تعین" میں ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں آج تک یہ مسئلہ حل نہ کر سکے۔ مگر اسلام کے عادلانہ معاشی نظام نے یہ جھگڑا ۱۴ سو سال پہلے حل کر لیا تھا اور اس کا حل آج بھی قابل عمل ہے

اور امن کی کلید ہے اس کتاب میں اسی حل کا تفصیل سے ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کی ابتداء ہم اس "ذہنی تبدیلی" سے کرتے ہیں جسے اسلام انسانوں کے تمام مسائل کے حل کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

ذہنی تبدیلی

اس کے لیے سب سے ضروری چیز عام باشندگان ملک اور خاص طور پر حکومت کے کارکنوں کی ذہنی تبدیلی ہے۔ جب تک ان میں ہمدردی، غمخواری اور دوسروں کی تکلیفوں کا احساس نہ پیدا ہوگا اس وقت تک کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ ملک میں اتنی بے روزگاری ہے اور مزدور طبقہ کتنا پریشان حال ہے۔ حکومت کے کسی وزیر یا بڑے چھوٹے عہدہ دار کی پیشانی پر بل آیا؟ کیا ان کو یہ خیال ہوا کہ اس کے لیے وہ اپنا ذاتی خرچ گھٹا دیں؟ یا وہ اپنے آرام و آسائش میں اس وقت تک کے لیے کمی کر دیں جب تک عام آدمیوں کی ضرورتیں نہ پوری ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں اسلام عام معاشرہ کے افراد، کارکنوں اور ذمہ داروں میں ایسا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جب وہ بے کاروں اور بے روزگار لوگوں کو دیکھیں تو ان کا خواب و خور حرام ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ آئے جن کے بدن پر ایک کمبل تھا اور گلے میں تلوار لٹکی ہوئی تھی مگر پیر جوتوں سے خالی تھے۔ آپؐ نے ان لوگوں کے فقر و فاقہ کی یہ کیفیت دیکھی تو فتمعّر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اور آپؐ نے فوراً ان کے سہارے کا انتظام فرمایا۔ اس کے بعد آپ کی یہ کیفیت دور ہوئی [1]

حکومت کا صدر اور وزیر اعظم ہو خواہ عام وزراء ہوں یا کارخانوں کے مالک اور افسران ہوں ان کے ذہن میں یہ بات پہلے دن سے بٹھا دی جائے گی کہ ان کے ماتحت اور مزدور جن

---

[1] مسلم شریف: ۵ / ۱۴۷ طبع کویت ۱۳۸۸ھ۔

سے وہ کام لیتے ہیں یا ان کے ذمہ جو کام سپرد ہوا ہے وہ سب ان کے ہاتھ میں امانت ہیں جس طرح ایک امین کے لیے ضروری ہے کہ جو امانت اس کے پاس رکھی ہوئی ہے وہ اسے ٹھیک طور پر امانت رکھنے والے کے پاس پہنچا دے اسی طرح یہ چیزیں اور ان کے حقوق بھی امانت ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔ (نساء: ۵۸)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں[1] کو ان کے مالکوں اور حقداروں تک پہنچا دو۔

اس کی تشریح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نقل فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ[2]

تم میں سے ہر شخص راعی[3] ہے اور اس سے اپنی رعیت[3] کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اس جملہ کے فرمانے کے بعد آپ نے پھر اس کی تفصیل فرمائی کہ امام اپنی رعیت یعنی عوام کا ذمہ دار اور امین ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا اور خادم اور غلام اپنے مالک کے مال کا ذمہ دار ہے۔ پھر آخر میں دوبارہ آپؐ نے وہ جملہ ارشاد فرمایا:

---

[1] امانت کا مفہوم اتنا ہی نہیں ہے کہ آپ کے پاس چند پیسے کسی نے امانت رکھے اور آپ نے واپس کر دیئے بلکہ اس میں ہر طرح کے حقوق اور ذمہ داریاں شامل ہیں۔

[2] مشکوٰۃ شریف: ۳۲۰: سعید کمپنی کراچی۔

[3] راعی اور رعیت کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے۔ راعی کے لفظی معنی چرواہے کے ہوتے ہیں جو اپنے جانوروں کی نگرانی کرتا ہے۔ اب اگر کوئی کسی قوم یا ملک کا سربراہ یا کسی کام کا ذمہ دار بنا دیا جائے تو وہ بھی راعی ہے۔ اور پوری قوم اور ملک یا جو ذمہ داری اس کے سپرد ہے وہ سب اس کی رعیت ہیں۔ بولتے ہیں۔ رعی الامیر القوم رعایۃ فھو راع ای قام باصلاح ما یتولاہ والرعیۃ کل من شملہ حفظ الراعی۔

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

دوسری حدیث جسے حضرت معقل بن یسار نے نقل فرمایا ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ۔ (بخاری شریف کتاب الاحکام باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح)

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی بندہ جس کے سپرد اللہ تعالیٰ نے کسی رعایا کی خبر گیری لگائی[1] تو اس نے پوری خیر خواہی کے ساتھ اس کی حفاظت نہیں کی تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

عن عمرو بن مرۃ انہ قال لمعاویۃ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من ولاہ اللہ شیئا من امر المسلمین فاحتجب دون حاجتھم وخلتھم وفقرھم احتجب اللہ دون حاجتہ وخلتہ وفقرہ فجعل معاویۃ رجلا علی حوائج الناس[2]

حضرت عمرو بن مرۃ نے حضرت معاویہ سے ایک دن کہا کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ میں اگر کسی شخص کے سپرد مسلمانوں کا کوئی معاملہ یا کوئی ذمہ داری ہو اور اس نے ان کی ضرورتوں دقتوں اور معاشی پریشانیوں اور فقر و فاقہ کی کوئی پرواہ نہ کی اور الگ تھلگ بیٹھا رہا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضرورت، دقت اور فقر و فاقہ

---

[1] اللہ تعالیٰ کے ذمہ داری ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو جو ذمہ داری ملی ہے اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ ہی نے یہ ذمہ داری اس کے سپرد کی ہے۔ اس تصور کی وجہ سے اسے اس کی باز پرس کا خیال لگا رہے گا اور بے راہروی سے بچا رہے گا۔

[2] ترمذی شریف ۱: ۲۱۱ طبع نور محمد کراچی۔

سے بے پرواہ رہے گا یہ حدیث سننے کے بعد حضرت معاویہ نے ایک شخص کو اسی کام پر مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی معاشی اور معاشرتی دقتوں کو معلوم کر کے ان کا حل نکالے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مزدور اور حاجت مند جب حاکم سے شکایت کرے تب ہی اس میں تکلیف کا احساس نہیں کرنا چاہیے، بلکہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود ان کی ضروریات کے بارے میں معلومات فراہم کرے اور ان کو رفع کرے۔[۱] قرآن و حدیث کی انہی ہدایات کی روشنی میں حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ جب کارکنوں اور ذمہ داروں کو کسی کام پر مقرر فرماتے تو یہ ہدایات دیتے تھے۔

لا ترکبوا برذونا ولا تاکلوا نقیا ولا تلبسوا رقیقا
ولا تغلقوا ابوابکم دون حوائج الناس[۲] فان فعلتم شیئا
من ذالک فقد حلت بکم العقوبۃ[۳]

عمدہ ترکی گھوڑوں پر سواری نہ کرنا اور نہ چپاتی کھانا اور نہ باریک کپڑا پہننا اور نہ اپنا دروازہ بند رکھنا کہ لوگ اپنی ضرورتیں آسانی سے نہ کہہ سکیں اگر ان میں سے کوئی کام بھی کرو گے تو سزا کے مستحق ہو گے۔

ان ہدایات کے آخر میں آپ نے یہ جملہ "حلت بکم العقوبہ" ارشاد فرما کر یہ واضح کر دیا کہ ان احکام کی حیثیت محض اپیل کی نہیں ہے بلکہ یہ قانونی دفعہ بھی ہے، جو کارکن ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھے گا قانون فوجداری کے تحت اسے سزا ملے گی۔

حضرت عمرؓ نے بہت دنوں تک گیہوں کی روٹی کھانی ترک کر دی تھی کہ مملکت کے سارے

---

[۱] موجودہ دور میں ہر حکومت نے ہر شعبہ زندگی کے لیے الگ الگ محکمے قائم کر رکھے ہیں مثلاً مزدوروں کے لیے لیبر انسپکٹر اور دوسرا عملہ موجود ہوتا ہے، کسانوں کے لیئے الگ، بے روزگاری کے لیے الگ مگر چونکہ ان محکموں کے کارکنوں میں کوئی اخلاقی ذہنیت نہیں ہوتی ہے اس لیئے اس سے جتنا فائدہ پہنچنا چاہیئے انہیں پہنچ پاتا بلکہ یہ محکمے خود رشوت خوری کا اڈہ بن گئے ہیں۔

[۲] ایک دوسری روایت میں ہے کہ ولا تغلقوا ابوابھم دونھم فیاکل قویھم ضعیفھم

[۳] (کتاب الخراج) ... ص۱۱۸ ... مشکوٰۃ شریف ...

لوگوں کو یہ میسر نہیں ہے۔ اس بارے میں صحابہؓ کا احساس تیز تھا کہ وہ جانوروں کی کسی تکلیف کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص کو غیر شاداب جگہ بکری چراتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ ایسی جگہ (چراگاہ) میں بکریاں لے جا کر چراؤ جہاں چارہ زیادہ ہو اس لیئے کہ قیامت کے دن ہر راعی (چرواہا، نگہبان، افسر) سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔[1]

جن لوگوں میں ذمہ داریوں کا پورا احساس نہ ہو یا اس ذمہ داری کے اٹھانے میں کمزوری دکھائیں ان کو یا تو عوام کے کاموں کی ذمہ داری دینی ہی نہیں چاہیئے یا اگر وہ مقرر ہو چکے ہوں تو ان کو معزول کر دینا چاہیئے، حضرت ابوذر غفاری جلیل القدر صحابی تھے ایک بار انہوں نے کسی جگہ کی امارت کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے فرمایا: انت ضعيف وهى امانة وهى يوم القيامة خزى وندامة الا من اخذها بحقها وادى ما عليه فيها یعنی تم کمزور آدمی ہو اور یہ ایک امانت ہے جو شخص اس کا پورا حق ادا نہ کرے گا قیامت کے دن اُسے رسوائی اور ندامت ہو گی،[2] اپنی جلالت شان کے باوجود اس ذمہ داری کو اُٹھانے کی طاقت ان میں نہ تھی اس لیئے آپؐ نے منع فرما دیا اس سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی کو وہ ذمہ داری نہ دینی چاہیئے جس کا وہ پورا حق نہ ادا کر سکتا ہو۔

۱۔ اس طرح سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں حتّٰی کہ خلفائے عباسیہ، خلفائے بنو امیہ اور مسلمان بادشاہوں میں جو اسلامی زندگی کے پورے طور پر حامل نہیں تھے، ان کی زندگی میں بھی اس طرح کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ گاندھی نے ... اسی وجہ سے کہا تھا کہ ہم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ اس کے لیئے دوسری تدبیر حکومت کے اخراجات میں کمی ہے۔ آج ملک کا ہزاروں لاکھوں

---

[1] الادب المفرد، من اشار علی اخیه وان لم یستشر۔ [2] کتاب الخراج ۹ - مؤلفہ امام ابو یوسف۔

بلکہ کروڑوں روپیہ محض وزیروں اور افسروں کے دورے اور تعیشات پر صرف ہوتا ہے۔ تحقیقاتی کمیشنوں، سفارت خانوں، خیر سگالی اور کلچرل وفدوں اور بے مقصد کھیلوں پر جو بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس میں سے کافی بچت ہو سکتی ہے [1]

ہندوستان کی مرکزی حکومت نے اس سلسلہ میں چند سال پہلے قدم اٹھایا تھا۔ مرکزی وزراء نے رضا کارانہ طور پر دس فیصدی اپنی تنخواہ کم کر دی اور بڑے بڑے افسروں اور صوبہ کے وزراء کی تنخواہوں میں کمی بھی زیر غور تھی۔ لیکن اس پر ایک دن بھی عمل نہ ہو سکا۔ اگر اس پر عمل بھی کیا جاتا تو جب تک ان لوگوں کی ذہنیت نہیں بدلتی اس وقت تک تنخواہوں میں تھوڑی سی کمی کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ وہ اس کمی کو دوسرے ذرائع سے پورا کر لیں گے۔

۳۔ وہ تمام چیزیں جو زندگی کے لیے ضروری نہیں بلکہ اخلاقی، معاشی اور طبی نقطہ نظر سے

---

[1] یہی حالت پاکستان کی ہے۔ یہاں بھی قومی خزانہ کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی فضول اور غیر ضروری اخراجات پر اڑا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس رقم میں ان مزدوروں اور کسانوں کا بھی حصہ ہے جو چلچلاتی گرمی اور کڑا کے کی سردی میں کام کر کے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے حکومت وقت کو ایک حصہ بطور ٹیکس دیتے ہیں اگر حکومت یہ خطیر رقم جو مذکورہ غیر ضروری اخراجات پر اڑا دیتی ہے اسے کفالت عامہ پروگرام (social security scheme.) کے تحت ان بے نواؤں پر خرچ کرے تو ان کی عزت کا کچھ تو مداوا ہو سکتا ہے۔ جس سے ان کی قوت پیدا وار (Productive Power.) اور قوت خرید (Purchasing Power.) دونوں میں اضافہ ہوگا۔ اور نتیجۃً اشیاء صرف (Consumer Goods.) اور اشیاء سرمایہ (Capital Goods.) دونوں میں اضافہ ہوگا اور ملک ترقی کرے گا۔

مضر ہیں ان کو یک قلم موقوف کر دیا جائے۔ اس پر ملک کا روپیہ بلا وجہ صرف ہوتا ہے۔ مثلاً شراب، قحبہ خانے، جنسی جذبات کو ابھارنے والی مصنوعات وغیرہ، بظاہر ان محکموں سے کروڑوں روپے آمدنی ہوتی ہے اس لیے اس میں ملک کا نقصان دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس سے جو خراب عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ عام معاشرہ کے ساتھ ان کا اثر مزدور اور کم آمدنی والوں پر بھی پڑتا ہے جو معاشرہ کے عام افراد ان بری عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ جو پیسہ اپنے بال بچوں کی آسائش پر صرف کرتے چند گھنٹے کی سرمستی میں صرف کر دیتے ہیں بلکہ بسا اوقات مقروض ہو جاتے ہیں، قرآن وحدیث میں ان کی کچھ تفصیل کر دی گئی ہے اور ان کی روشنی میں فقہاء نے ایسی تمام چیزوں کے بنانے اور فروخت کرنے پر پابندی عائد کی ہے جو ان کے زمانہ میں اس زمرہ میں آتی تھیں آج کے دور کے لحاظ سے اس میں مزید اضافہ ممکن ہے۔

۴۔ زر سے زر پیدا کرنے کی جتنی صورتیں ہیں وہ سب ممنوع قرار دی جائیں یعنی سود کے ذریعہ بغیر کسی محنت کے آدمی روپیہ سے جو روپیہ کماتا ہے وہ سب موقوف ہو جانا چاہیے۔ اس سے مصارف پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس کا بار آخر کار مزدوروں اور کم آمدنی والوں پر پڑتا ہے۔

۵۔ ذخیرہ اندوزی کی قطعی ممانعت کر دی جائے۔ ذخیرہ اندوز خواہ صنعت کار یا زمیندار ہوں یا کسان و تجار، ان میں سے کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ جب چاہیں ضروریات زندگی بازار سے غائب کر دیں اور پھر مصنوعی قحط اور اشیاء کی قلت کی کیفیت پیدا کر کے لوگوں کو مجبور کریں کہ وہ روپیہ جو انکی جیبوں بلکہ جھونپڑیوں تک میں ہے اسے لا کر ان کے قدموں میں ڈال دیں ایسے لوگوں کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اوپر ذکر آچکا ہے کہ اگر معیار اجرت چاہے کتنا ہی اونچا کر دیا جائے مگر اشیاء کا بھاؤ متوازن نہ ہو تو اجیر کبھی مطمئن نہ ہوگا۔

۶۔ جوئے، سٹے اور مستقبل کے وعدے کے سودے قطعی حرام قرار دیئے جائیں۔ اس سے یہی نہیں کہ بلا محنت اور بلا کچھ خرچ کئے ہوئے روپے کمانے کی ذہنیت پرورش پاتی ہے بلکہ اس سے ملک کی تجارتی حالت اور اشیاء کی قیمتیں ڈانواڈول رہتی ہیں۔ اور ایک آدمی کے فائدے میں نہ جانے کتنے لوگوں کا نقصان مضمر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیز آدمی کو خود غرض اور بددیانت بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے بسا اوقات اپنی دولت کے ساتھ ملک و قوم کی دولت کو بھی اس میں لگا دینے سے دریغ نہیں کرتے اس کی مثال اکتوبر ۵۵ئہ میں ڈالمیا کی گرفتاری ہے۔ ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا تاجر جس نے محض زیادہ سے زیادہ فائدہ سمیٹ لینے کے لیے قوم کا دو کروڑ روپیہ خرد برد کرنے میں دریغ نہیں کیؒ[1]

اس طرح ایسے تمام طریقہ تجارت کو ممنوع قرار دیا جائے جس کا فائدہ تاجر بیچ ہی سے اچک لیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں رواج تھا کہ دیہاتی کسان اپنا غلہ لے کر بازار میں فروخت کرنے آتے تھے تو چالاک تاجر یا ان کے دلال آگے پہنچ کر ان کے بازار میں آنے سے پہلے ہی غلہ خرید لیتے تھے اور پھر اپنی من مانی قیمت پر اسے فروخت کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔

لا یبیع الحاضر للبادی[2]

---

[1] گو فاضل مصنف کا یہ بیان ہندوستان کے سرمایہ دارانہ طبقہ کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے مگر سرمایہ دار طبقہ کی یہ ذہنیت ہر دور اور ہر مقام میں ایک ہی جیسی ہے اس کی وجہ دراصل زیادہ سے زیادہ نفع کمانے (Profit Maximization.) کا نظریہ ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے جس کی وجہ سے ہر سرمایہ دار تاجر اپنے ابنائے جنس کی پرواہ کیے بغیر زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تاجر ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا اس کی ذہنیت یکساں ہوگی۔

[2] مشکوٰۃ: ۲۴۷ طبع سعید کمپنی کراچی۔

کوئی شہری تاجر دیہات کے لوگوں کی چیزیں بیچ میں نہ خریدے۔

آج چھوٹے چھوٹے کسانوں، کاریگروں اور محنت پیشہ مزدوروں کی محنت اور صنعت کا حال یہی ہے کہ ان کا زیادہ فائدہ بیچ کے لوگ کھا جاتے ہیں۔

چھوٹی صنعتیں

ان طریقوں سے جو روپیہ بچے وہ آبادی کی زیادتی کو کھپانے اور مزدوروں کی زیادہ تعداد کو کام مہیا کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی ترقی میں لگایا جائے۔ اس وقت دنیا کے بیشتر صنعتی ملکوں میں اس کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ مگر چونکہ موجودہ معاشی نظام اور ملک کے ذمہ داروں کے نقطہ نظر میں مذکورہ بالا خرابیاں موجود ہیں۔ اس لیے اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ مگر مذکورہ بالا خرابیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ چیز جتنی توجہ چاہتی ہے اتنی توجہ اس پر نہیں ہے۔ ہندوستان اور اس کی طرح کے دیگر ترقی پذیر ممالک مثلاً پاکستان وغیرہ کو اس کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت تھی لیکن اس نے بڑی صنعتوں کے مقابلہ میں اس کو خاص اہمیت نہیں دی ہے اوپر ہم نے بڑی صنعتوں اور چھوٹی صنعتوں کے لیے حکومت نے جو رقم منظور کی ہے اس کے اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا ہے کہ اگر ملک کے بیکار لوگوں کو باکار بنانا ہے تو پھر جو رقم بڑی صنعتوں کے لیے رکھی گئی ہے وہ چھوٹی صنعتوں میں لگا دی جائے اور چھوٹی صنعتوں کی رقم کو بڑی صنعتوں میں صرف کیا جائے۔ مگر یہاں واقعی عوام کی فلاح اور ان کی ترقی سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ دنیا کے سامنے اپنے کارناموں کی فہرست میں اضافہ کر دیا جائے۔ خواہ اس سے ملک کے باشندوں کو کچھ بھی فائدہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں ہر چیز کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ آج جاپان اور بعض دوسرے مغربی ممالک میں بے روزگاری اسی وجہ سے کم ہے کہ جاپان کا ہر گھر چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا مرکز ہے۔

بعض دوسری تدبیریں

غریبوں، مزدوروں اور آبادی کی زیادتی کو کھپانے کے لیے بعض اور تدبیریں بھی ہیں جن کی اسلام نے

اجازت دی ہے۔ اگر ان پر عمل درآمد ہو جائے تو لاکھوں آدمیوں کی روزی کا سامان ہو سکتا ہے۔

(۱) احیاء مُوات یعنی وہ زمینیں جو بے کار پڑی ہیں۔ ان کو جو شخص قبضہ میں لے آئے گا وہ اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ وہ زمین بالکل ہی بے کار اور بنجر ہو۔ اس پر کبھی کھیتی باڑی نہ کی گئی ہو نہ وہ کسی کی ملکیت ہو تو اس کو جو شخص بھی اپنے قبضہ میں لا کر کھیتی باڑی کرے گا وہ اس کی ملک ہو گی۔ بشرطیکہ وہ جگہ کسی مفاد عامہ کے استعمال میں نہ ہو۔ مثلاً چراگاہ، قبرستان یا کسی اور ضرورت کے لیے۔

امام ابو حنیفہؒ نے اس میں حکومت سے اجازت کی بھی شرط لگا دی ہے۔ یعنی بغیر حکومت کی اجازت کے اس کو کسی زمین پر قبضہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ مگر صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے بغیر اجازت بھی اس کو قبضہ کرنے کا حق دیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کی توجیہ کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی یہ رائے اس صورت میں ہے جب اختلاف کا خدشہ ہو ورنہ عام حالت میں حکومت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مصالح عامہ کے تحت بہتر یہ ہے کہ حکومت وقت کی اجازت اس میں شامل ہو۔

امام مالکؒ نے اس بارے میں یہ رائے دی ہے کہ اگر وہ مقام دشوار گذار جگہ پر ہو یا بالکل ویرانہ ہو تو اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر آبادی کے قریب کی زمین ہو تو اجازت کی ضرورت ہے

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ وہ بغیر اجازت بھی زمین پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اگر قانونی اجازت کی پابندی لگا دی جائے تو غریب اور دور دراز جگہوں کے رہنے والوں کے لیے ایک نئی مصیبت پیدا ہو جائے گی۔

مگر موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آمد و رفت اور نقل و حمل کی سہولتیں پیدا کر دی ہیں دوسری طرف معاشرہ کے افراد میں امانت و دیانت کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان ہو گیا ہے ان کے پیش نظر اس زمانہ میں قانونی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق ہی عمل کرنا اسلامی حکومت کے لیے مناسب ہے ورنہ اس طرح ایک انارکی اور لاقانونیت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ زمینیں جن کے مالک تو ہیں مگر انہوں نے اس کو بالکل بیکار چھوڑ رکھا ہے یا ان کے مالکوں کا پتہ نہیں ہے ایسی زمین کے لیے حکومت خود فیصلہ کرے گی اور جن لوگوں کے پاس زمین نہ ہو گی ان میں تقسیم کرے گی۔ اس کے لیے ایک شرط ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک بے کار چھوڑ دی گئی ہو۔ دونوں صورتوں کی تفصیل حدیث و فقہ میں موجود ہے [1]

حکومت کو چاہیے کہ عطیل اور بے کار زمین غریبوں کو دے اور ان کو کار آمد بنانے میں ان کی مدد کرے اس طرح زمینوں کا رقبہ بھی بڑھ جائیگا اور امیر و غریب کے جھگڑے بھی اتنی کثرت سے پیدا نہ ہونگے۔

وہ اشیاء جن پر کسی کی ملکیت نہیں ہے

اسلامی قانون میں ان تمام چیزوں پر پوری نوع انسانیت کا مساوی حق ہے جو اپنی پیدائشی اور قدرتی حالت میں کار آمد ہوتی ہیں اور ان میں انسانی محنت (Human Labour.) کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً جنگل کی لکڑیاں، میدانوں کی گھاس اور ان کے جانور، دریا کا پانی اور اس کی مچھلیاں۔ فضا کے پرندے کوہستانوں کے پتھر، کھلی ہوئی کانیں، وہ معدنی اشیاء جن پر حکومت نے اپنا کوئی خرچ نہیں کیا ہے۔

اسلام نے یہی نہیں کہ ان چیزوں پر کسی کا حق ملکیت تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ اگر کوئی شخص

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب الاموال، ہدایہ اور افصاح وغیرہ

ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے بغیر کچھ خرچ کئے ہوئے کسی مزدور کو مزدوری پر رکھے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے بلکہ مزدور جو کچھ حاصل کرے گا وہ اس کی ملک ہوگی۔ اگر اس نے کچھ خرچ کیا ہے تو دونوں اس میں حصہ دار ہوں گے۔ اگر کوئی جنگل کی لکڑی کٹوائے یا دریا سے مچھلی پکڑوائے تو جب تک اس نے اس میں کوئی محنت نہ کی ہو یا کچھ خرچ نہ کیا ہو وہ لکڑی یا مچھلی میں حصہ نہیں پا سکتا بلکہ وہ مزدور کی ملک ہوگی۔

اس سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام نے حق ملکیت میں جو عمومیت اور آزادی رکھی ہے اس سے ملک کی دولت میں کسی قسم کی اجارہ داری نہیں پیدا ہونے پائے گی دوسرے یہ کہ محنت کے لیے اس نے اتنے مواقع فراہم کئے ہیں اور اس کو اتنی عزت بخشی ہے کہ مستاجر اجیروں کی مجبوری سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ:

الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار [1]

تین چیزوں میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں وہ ہیں: گھاس اور پانی اور آگ

دوسری روایت ہے کہ:

لا تمنعوا کلاءً و لا ماءً ولا نارًا فانه متاع للمقوین وقوة للمستضعفین [2]

کسی کو گھاس، پانی اور آگ سے مت روکو اس لیے کہ یہ غیر مستطیع لوگوں کا سامان رزق اور کمزوروں کا سہارا ہیں۔

اس حدیث کے آخری الفاظ اس جذبہ محبت کو واضح کرتے ہیں جو آپ کے دل کے

---

[1] کتاب الاموال۔ ص ۲۱۱۔

[2] کتاب الخراج۔ صفحہ ۵۵۔

اندر کمزور، بے سہارا اور محنت کش طبقہ کی معاشی خوشحالی کے لیے موجود تھا۔ ایک روایت میں الملح کا لفظ بھی ہے یعنی نمک بھی مشترک ملکیت کی چیز ہے۔ اسی طرح آپ نے دجلہ اور فرات کا نام لے کر فرمایا کہ یہ بھی سب کی ملکیت ہیں[1]

آپؐ کے انہی فرمودات کی روشنی میں آئمہ فقہ نے اجتہاد کیا ہے کہ سمندر بھی انسان کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اس پر کسی کی اجارہ داری صحیح نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں،

الا نتفاع بماء البحر کالانتفاع بالشمس والقمر والھواء[2]

دریا اور اس کے پانی سے ہر شخص کو اسی طرح فائدہ اٹھانے کا حق ہے جس طرح ہر شخص سورج، چاند اور ہوا سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ایک شخص جنگل کی لکڑی، پانی کی مچھلی، سمندر کے موتی مونگے، نمک کی کھلی ہوئی کان سے اپنی ذاتی محنت کے ذریعہ جتنی چیزیں چاہے حاصل کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ ان اشیاء کو عمومی ملکیت قرار دینے سے لاکھوں آدمیوں کی روزی کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگ لکڑی کاٹ کر بیچیں گے۔ کچھ لوگ اس سے سامان تیار کر دیں گے۔ کچھ لوگ اس کو اپنی ذاتی ضرورت کے لیے حاصل کریں گے۔ اس طرح پانی کی مچھلیاں اور سمندر کے پوشیدہ ذخیروں سے لاکھوں آدمیوں کا سامانِ روزی مہیا ہو سکتا ہے۔ اس وقت مچھلی کی تجارت سے حکومت ہند کو لاکھوں روپیوں کا فائدہ ہوتا ہے چنانچہ یوپی کے ایک ضلع اٹاوہ کی مچھلی کی تجارت کی تفصیل چھپی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ضلع میں مچھلی پکڑنے کا ٹھیکہ

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۵۵۔

[2] ہدایہ ج ۴ باب مسائل الشرب۔

ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ میں دیا گیا ہے [1]

(قومی آواز - ۱۰/ اکتوبر ۵۹ء)

آج یہ ٹھیکہ دوگنی قیمت پر .... دیا جاتا ہے

ہزاروں آدمی کشتی رانی، جہاز رانی اور پن چکیاں قائم کرکے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

نمک کی کان اور کوہستان کے پتھروں سے لاکھوں آدمی اپنی روزی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اسلامی حکومت جو آسانیاں فراہم کرے گی اس کی بحث آگے آئے گی۔

اس سلسلہ میں اسلام کا قانون شراکت بھی بہت زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ یعنی چند مزدور مل کر ایک شراکتی فرم بنالیں اور قدرت کی اس فیاضی سے فائدہ اٹھائیں جیسا کہ آج کل کوآپریٹو سوسائٹی کا رواج ہے۔

کیا ان تدبیروں کے اختیار کرنے کے بعد اس بات کا امکان ہے کہ ملک کی کثیر سے کثیر آبادی کے رزق کا سامان فراہم نہ ہو جائے؟ قدرت کی طرف سے جو ذرائع رزق فراہم کئے گئے ہیں وہ اتنے وافر ہیں کہ آبادی کی کثرت اس کو مغلوب نہیں کر سکتی ہے۔ مسٹر مالتھیس (Malthus.) کا یہ نظریہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ آبادی تو سلسلہ ہندسیہ (یعنی ۲، ۴، ۸، ۱۶ وغیرہ) کے اعتبار سے بڑھتی ہے۔ اور سامان رزق و ذرائع معاش سلسلہ حسابیہ (یعنی ۱، ۲، ۳ وغیرہ سے بڑھتے ہیں۔ پیدائش دولت آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی مگر قدرت کے اس مشترکہ دولت کے خزانوں

---

[1] یہی حال پاکستانی معیشت میں ماہی گیری کا ہے۔ پاکستان میں اگر ماہی گیری کی صنعت کو ترقی دی جائے اور اس صنعت کو سرکاری تحویل کی بجائے عام شہریوں کے لیے چھوڑ دیا جائے تو اس سے ہزاروں انسانوں کی روزی اور روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے پچھلے دنوں پاکستانی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اس صنعت میں پاکستان دوگنی ترقی کر رہا ہے۔ پاکستان کے شہری چاہیں تو اس صنعت کو شراکتی بنیادوں Partnership. پر بھی چلا سکتے ہیں۔ حکومت صرف ان کو مطلوبہ آلات و سامان مہیا کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرے اور انہیں تحفظ کا یقین دلائے۔

سے مزدور اور بے روزگار اشخاص اسی وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب حکومت ان کے لیے ایسی سہولتیں فراہم کرے جس کی وجہ سے وہ ان سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں حکومت کا فرض ہے کہ یہ باتیں اپنے ذمہ لے لے۔

۱۔ مزدوروں اور بے روزگاروں کی آبادی جہاں زیادہ ہو وہاں وہ کارخانے کھولے یا سرمایہ داروں سے کھلوائے تاکہ مزدور آسانی سے اپنی روزی کما سکیں۔

۲۔ مزدوروں کو وہ تمام معلومات فراہم کی جائیں جن سے ان کو یہ معلوم ہو کہ ملک کے کس حصہ میں کون سا روزگار مل سکتا ہے۔

۳۔ مزدوروں کو تبدیلی پیشہ کی پوری آزادی ہو۔

۴۔ ان کو ترغیب دی جائے کہ وہ قدرت کی پیدا کی ہوئی اشیاء سے اپنی محنت کے ذریعہ فائدہ اٹھائیں۔

۵۔ ان کو نقل وحمل کی زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے تاکہ وہ ملک کے جس حصہ میں چاہیں جا کر قدرت کے وسائل رزق سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ تو وہ تدبیریں ہیں جن کا تعلق ملک کی اندرونی معاشی اصلاح اور اس کے چھپے ہوئے ذرائع رزق سے فائدہ اٹھانے کے مواقع سے ہے۔ اس کے علاوہ خارجی تدبیریں بھی ہیں جن کا تعلق صرف حکومت سے ہے۔ اگر دنیا کی حکومتیں انسانی ہمدردی کے نام پر اس کے لیے تیار ہو جائیں تو پھر ان کے اندازہ کے مطابق ہی کم از کم سو برس تک دنیا کی آبادی کے لیے روزی کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہو گا۔

انتقال آبادی اس سلسلہ میں ایک تجویز عاجز کے ذہن میں ایسی ہے جسے ممکن ہے کہ موجودہ دور کے معاشیین کوئی خیالی اور ناقابل عمل تجویز قرار دیں مگر ہم اس امید پر پیش کرتے ہیں کہ دنیا سے ابھی انسانی ہمدردی کا جذبہ بالکل مفقود نہیں ہو گیا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر برٹرنڈ رسل نے انسانیت کے نام پر یہ اپیل کی ہے کہ جنگ

کو ہر ممکن طریقہ سے روکا جائے اسی طرح صرف انسانیت کے نام پر یہ تجویز پیش کی جاتی ہے۔ گو کہ یہ معلوم ہے کہ دنیا کا برسر اقتدار طبقہ اس بارے میں اس قدر بے حس ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کی تجویز سننے کے لیے تو تیار ہے مگر اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مگر چونکہ بہرحال وہ مفید ہو سکتی ہے اس لیے پیش کی جاتی ہے۔ وہ تجویز ہے انتقال آبادی کی۔

آج سے سو برس پہلے جب حکومتوں کا دائرہ اختیار اتنا وسیع نہیں ہوا تھا اور رسل و رسائل کے ذرائع بہت محدود تھے اور راستے بھی اتنے پرامن نہیں تھے مگر اس کے باوجود ایک مقام کے آدمی دوسرے مقام پر، ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک میں حصول معاش کے لیے جاتے تھے اور جب چاہتے تھے واپس چلے آتے تھے اور اگر ان کا جی چاہتا تو وہ وہیں متوطن بھی ہو جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کو جنگ کے علاوہ کسی زمانہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں دنیا کے ہر خطہ اور ہر قوم کے باشندے نہ پائے جاتے ہوں۔ مگر جب سے حکومت نے اپنا پنجہ اقتدار پھیلا لیا ہے تو باوجود اس کے کہ پہلے کے مقابلہ میں رسل و رسائل کے ذرائع میں سو گنا بلکہ ہزار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اور راستے پرامن ہو گئے ہیں۔ مگر موجودہ دور کا آدمی اپنی اس فطری آزادی سے اس وقت بالکل محروم ہو چکا ہے جن ملکوں کے درمیان سرد یا گرم جنگ جاری ہے یا اس کے امکانات پائے جاتے ہیں، اگر ان کے درمیان آمد و رفت کی پابندی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ان کو اخلاق و قانون دونوں حیثیتوں سے ایسا کرنے کا حق ہے۔ مگر جن ملکوں میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے آج وہاں بھی کسی ملک کا آدمی آزادی کے ساتھ جا کر اپنی روزی نہیں کما سکتا۔ بلکہ اس مہذب دنیا کو جذبہ قومیت و وطنیت نے یہاں تک اندھا کر دیا ہے کہ وہ لوگ جو سینکڑوں سال پہلے کسی ملک سے جا کر دوسرے ملک میں بس گئے ہیں اور وہاں کے شہری ہو چکے ہیں ان کو ان کے حقوق شہریت سے بھی محروم کیا جا رہا ہے۔ بلکہ بعض قومی حکومتیں ان کو ان کے قدیم وطن واپس کر رہی ہیں اور لاکھوں کو شش رہی ہیں

آج امریکہ کے نیگرو اور ریڈ انڈین قوم کے ساتھ وہاں جو سلوک کیا جا رہا ہے اس سے دنیا کا کوئی پڑھا لکھا آدمی ناواقف نہیں ہے۔ حتیٰ کہ عام طور پر نیگرو بچے اور امریکی بچے ایک ساتھ اسکول میں پڑھ بھی نہیں سکتے۔ حالانکہ یہ نیگرو وہاں کے قدیم باشندے ہیں اور امریکی ان کے مقابلہ میں آفاقی ہیں۔ ۱۹۵۴ء کے اخیر میں امریکی حکومت نے جمہوریت کی لاج رکھنے کے لیے بعض اسکولوں میں تجربہ کے طور پر یہ اجازت دیدی ہے کہ نیگرو بچے اور امریکی بچے ساتھ ساتھ پڑھیں۔ اس کے خلاف امریکی لڑکوں میں اس قدر اشتعال پیدا ہوا کہ وہ اسکول چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

ستمبر ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک نیگرو نوجوان نے کسی سفید فام عورت کو دیکھ کر ازراہِ مذاق سیٹی بجادی۔ جس پر سفید فاموں کی آتش حمیت اتنی بھڑکی کہ اس نوجوان کو وہیں قتل کر دیا۔ جرم یہ نہیں تھا کہ سیٹی کیوں بجائی۔ اس لیے کہ اس سے بڑے بڑے جرائم سڑکوں پر کھلے بندوں ہوتے ہیں بلکہ یہ تھا کہ سفید آقا کے ہم قوم کے ساتھ ایک سیاہ فام غلام نے یہ جرأت کیسے کی۔

اس طرح افریقہ میں آج آفاقی انگریز وہاں کے قدیم باشندوں اور دوسرے سیاہ فاموں کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ہر ایک شخص واقف ہے خود ہندوستان میں چھوت چھات کی لعنت موجود ہے۔

حکومت ہند نے اچھوت ادھار کی تحریک کئی برس پہلے چلائی تھی۔ مگر اس میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ جب تک اچھوتوں کو سماج کے بنیادی حقوق تک نہ مل جائیں اس وقت تک ان کو دوسرے حقوق کیسے مل سکتے ہیں۔ سب سے عجیب و غریب معاشرہ سری لنکا کا ہے۔ جس نے وہاں کے ہزاروں ہندوستانیوں کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کو لنکا سے باہر نکال دیا جائے۔

اسی طرح چینیوں کی جو آبادی مشرق بعید انڈونیشیا، برما، ملایا اور تھائی لینڈ میں پھیلی ہوئی ہے اور وہاں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال رہی ہے ان کو وہاں کی حکومتیں نکالنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح اسرائیلی حکومت بھی قدیم عرب آبادی کو نکال کر وہاں آفاقی یہودیوں کو لے جانے

پر تلی ہوئی ہے اور دنیا کی بڑی طاقتیں اس کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔

اگر آج دنیا سے جغرافیائی حد بندی نہ سہی کم از کم رنگ و نسل کی موجودہ حد بندی بھی ختم ہو جاتی اور دنیا کی تمام حکومتیں انسانیت کے نام پر انسانوں کا یہ حق تسلیم کر لیتیں کہ خواہ وہ کسی دوسرے ملک میں جانا چاہیں تو ان کو اس بات کی کھلی آزادی ہو۔ کسی جانے والے کے دل میں یہ خیال نہ رہے کہ جس سرزمین میں وہ بس رہا ہے اس سے باہر اس کے رزق کے حصول کی کوئی سبیل نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے اس کے دل میں یہ خیال ہو کہ یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اس لیے یہ انسان کی مشترکہ ملکیت ہے۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست

اسی کے ساتھ وہ جس ملک کو چھوڑ رہا ہے اور جس ملک میں جا رہا ہے ان دونوں جگہوں کی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے اس کے لیے آسانیاں فراہم کریں۔

اس تجویز کا مقصد کسی لاقانونیت اور انارکزم (Anorchism.) کی طرف دعوت دینا نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے میں کم سے کم قانونی پابندیاں عائد کی جائیں۔ اور جن ممالک میں واقعی آبادی کی کھپت کی گنجائش ہو۔ وہاں جانے میں کسی انسان کو اس لیے رکاوٹ نہ ہو کہ وہ اس کا ہم رنگ و ہم نسل نہیں ہے۔ اسی طرح جو آبادی جہاں اپنا آذوقہ حاصل کر رہی ہے اس کو کسی حکومت کو نکالنے کا حق حاصل نہ ہو۔

یہاں چند ملکوں کی آبادی اور رقبے کے اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ وطنیت اور قومیت کے اندھے جذبہ سے اوپر اٹھ کر کسی بین الاقوامی معاہدہ کے تحت اس تجویز پر عمل کیا جائے تو کم از کم سو سال تک آبادی کی کثرت، بے روزگاری اور محنت کی ناقدری پر غور کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔

آسٹریلیا آسٹریلیا کی آبادی صرف ایک کروڑ کچھ لاکھ ہے اور اس کا رقبہ ۲۹ لاکھ مربع میل ہے ... کوئی بنجر علاقہ نہیں ہے بلکہ ... علاقہ ... ہے

آسانی سے ۴۰ ہ کروڑ آدمی منتقل ہو کر اپنا آذوقہ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن آج آسٹریلیا کی حکومت کسی غیر عیسائی کو لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بلکہ وہ مغربی نیوگنی پر بھی اپنا قبضہ جمانے کی فکر میں ہے۔

کینیڈا اس کی آبادی ایک کروڑ سے کچھ ہی زیادہ ہے مگر اس کا رقبہ ۳۸ لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ہے یعنی ہندوستان سے اس کی آبادی ۳۵ گنا کم اور رقبہ تقریباً ۳ گنا زیادہ ہے۔

روس اسی طرح روس کی آبادی محض ۲۳ کروڑ ہے اور اس کا رقبہ تقریباً ۸۷ لاکھ مربع میل ہے۔ یعنی ہندوستان سے تقریباً ۷ گنا زیادہ اور آبادی $3\frac{1}{2}$ گنا کم ہے۔

امریکہ امریکہ کی آبادی ۱۸-۱۹ کروڑ کے درمیان ہے اور اس کا رقبہ ۲۹ لاکھ مربع میل ہے۔ یہاں پیداوار کی حرکت کا حال یہ ہے کہ لاکھوں ٹن غلہ ہر سال اس لئے برباد کیا جاتا ہے کہ دنیا کے بازار میں غلہ کی ارزانی نہ ہونے پائے۔

مثال کے لیے یہ چند زرخیز ملکوں کی آبادی اور ان کا رقبہ دیا گیا ہے۔ ورنہ اس طرح دنیا میں سینکڑوں جگہیں ایسی ہیں جہاں لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کو بسایا اور ان کی روزی کا سامان فراہم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ارجنٹائنا، برازیل، سعودی عرب وغیرہ۔

اس تجویز پر عمل درآمد کے سلسلہ میں یہ خیال ضرور پیدا ہوگا کہ یہ ناممکن ہے۔ مگر اس پہلو سے غور کیجیے کہ عملاً اس وقت بھی انتقال آبادی کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر وہی رنگ ونسل کے سوال پر۔ مثال کے لیے آسٹریلیا، کینیڈا اور اسرائیل کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ آسٹریلیا کی قریب قریب پوری آبادی آفاقیوں یعنی غیر ملکیوں کی ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم کامن ویلتھ کی میٹنگ میں ہندوستان آئے تھے انہوں نے اپنے ایک بیان میں یہ کہا کہ ہندوستان ہر سال ایک آسٹریلیا کو جنم دیتا ہے، یعنی اپنے ملک کی آبادی کی کمی کی طرف اشارہ کیا (قومی آواز یکم دسمبر ۱۹۸۳ء)

اگر ان کے یہاں دوسرے ملکوں کے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے جگہ نکل سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے اس کی گنجائش نہ ہو۔ اسی طرح کینیڈا نے گذشتہ صدی میں بیرونی ملکوں سے ہزاروں آدمیوں کو بلا کر مفت زمینیں دیدیکر آباد کیا تھا۔ اور اب بھی عیسائیوں کے لیے وہاں کی زمین تنگ نہیں ہے مگر غیر عیسائی کے لیے ان کے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے اسی طرح اسرائیل جیسی چھوٹی جگہ میں ساری دنیا کے یہودی سمٹ سمٹ کر آتے ہیں۔

غرض یہ کہ خدا کی طرف سے سامان رزق کی کوئی کمی نہیں کی گئی ہے۔ قیامت تک جو لوگ بھی پیدا ہوں گے ان میں سے ہر شخص کے لیے اس نے رزق پیدا کیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ مگر یہ انسانوں کی ناانصافی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کو اس سے محروم کر دیا۔

اسلام کی ہدایات

اسلام اس بارے میں کسی انسان پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ وہ ذرائع رزق کو تمام بندگان خدا کا مشترکہ سرمایہ سمجھتا ہے وہ افراد کی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے مگر کسی انسان یا حکومت کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ بے کار زمین کا مالک بن بیٹھے جو کسی فرد کی ملک نہیں ہے اور وہاں کسی کو گھسنے نہ دے۔

دنیا کے کسی حصہ پر اگر اسلامی حکومت قائم ہوگی تو حالت جنگ کے علاوہ وہ کسی غیر ملکی پر ذریعہ رزق کے حصول کے سلسلہ میں کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ اگر اس قوم کا کوئی فرد بھی جس سے عملاً جنگ جاری ہے اجازت لے کر اسلامی مملکت میں آنا چاہے تو اس کو اس بات کی آزادی ہوگی۔ اسلامی مملکت اس کو روک نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ اگر اس پر حکومت کو جاسوسی کا شبہ ہو جائے تو پھر وہ اس کو اس کے ملک واپس کر دے گی۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے کسی وقت کسی کا رزق بند نہیں کیا جا سکتا وہ رنگ و نسل کی بنا پر انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ قرآن کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں باپ کی نسل ہو تو اس رشتہ کے بارے میں ایک دوسرے کا لحاظ رکھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے

ہیں سارے انسان بھائی بھائی ہیں۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ قرآن زمین اور اس کے ذرائع کے بارے میں کہتا ہے کہ:

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (البقرۃ : ۲۹)

جو کچھ زمین میں ہے خدا نے اس کو تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ۔ (الرحمٰن : ۱۰)

اللہ نے زمین ساری مخلوق کے لیے پیدا کی ہے۔

انسان کے اس فطری حق و آزادی کی خاطر عہد نبوی اور عہد صدیقی میں غیر ملکی تاجروں ہی پر نہیں بلکہ ان ممالک کے تاجروں پر بھی کوئی ٹیکس یا چنگی نہیں لگائی گئی جن سے مسلمانوں کی جنگ جاری تھی۔ تاکہ وہ آزادی سے چل پھر کر اپنی روزی کما سکیں، مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان تاجروں سے غیر مسلم ممالک میں بڑی سختی کے ساتھ تجارتی ٹیکس اور چنگیاں وصول کی جانے لگیں تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو بصرہ کے گورنر تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ اجنبی اور محارب ملکوں میں مسلمان تاجر جاتے ہیں تو وہ ان سے محصول لیتے ہیں۔ آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ ان کے تاجروں سے تم بھی درآمدی محصول لو۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہدایت کر دی۔

۱۔ خذ انت عنهم كما ياخذون من تجار المسلمين [1]

تم بھی اتنا ہی محصول لو جتنا کہ وہ مسلمان تاجروں سے لیتے ہیں۔

۲۔ دو سو درہم سے کم مال پر کوئی محصول نہ لیا جائے۔ یعنی چھوٹے تاجر اس سے بہر حال مستثنیٰ ہوں گے۔

۳۔ اموال کی زیادہ تفتیش نہ کی جائے۔ بلکہ جو ظاہر چیزیں ہوں اسی کا محصول لیا جائے [2]

---

[1] کتاب الخراج ص۸۰۔ [2] کتاب الخراج ص۵۲۹، ایضاً ص۷۹۔

۴۔ سال میں ایک بار ٹیکس لیا جائے۔ اس کے بعد سال بھر اسلامی مملکت میں تاجر جہاں چاہے جائے۔ اس سے کوئی محصول نہ لیا جائے۔

۵۔ ان کے جان و مال کی حفاظت حکومت پر ہو گی ؎۱

غرض یہ کہ یہ محصول محض ایک ظلم کے انسداد کے طور پر لیا جاتا تھا۔ اس سے بندگان خدا کی نقل و حرکت اور ذریعۂ معاش پر پابندیاں عائد کرنا مقصود نہیں تھا۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو اس محصول کے ساتھ یہ مذکورہ ہدایتیں آپ نہ دیتے۔ اور پھر انہی ہدایات پر آپ نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ:

اگر بفرض محال محارب ملکوں میں اسلامی مملکت کے تاجروں کا کل مال ہڑپ کر لیا جائے تو بھی تم ان کا مال نہیں لے سکتے۔

اِنَّہٗ غَدَرٌ ؎۲ یہ ایک طرح کی بدعہدی ہے۔ (اگر وہ کرتے ہیں تو کریں تم نہیں کر سکتے۔)

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے ہمارا مقصود صرف اتنا ہے کہ: لیترکوا من تجارنا۔

تاکہ وہ ہمارے تاجروں سے لینا چھوڑ دیں۔

اگر وہ اس سے باز آ جائیں تو پھر ہمارا بنیادی نقطۂ نظر ہی اخلاق و مروت کی تائید و ترویج ہے:

ونحن احق بمکارم الاخلاق۔ ؎۳

ہمدردی اور انسانیت دوستی کے ہم زیادہ اہل (ذمہ دار) ہیں۔

؎۱ شرح السیر الکبیر: ۴، ۱۲۳۰۔

؎۲ ہدایہ۔ کتاب الزکاۃ۔

؎۳ ایضاً۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے بعض معاشی اور سیاسی مصالح کی بنا پر ایسا کیا تھا ورنہ اسلام کی اصل روح یہی ہے کہ اس طرح کی پابندیوں سے انسان کو آزاد کیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی مملکت میں آمد ورفت یا حصول معاش کے معاملہ میں کسی انسان پر اس لیے پابندی نہیں عائد کی جائے گی کہ وہ فلاں رنگ ونسل یا فلاں قوم وملک کا ہے۔ اسلام اخلاق و معاملات میں دائمی طور پر انسان کے کسی فرد سے کوئی تمیز اور اجنبیت کا برتاؤ جائز قرار نہیں دیتا۔ وہ اگر کوئی تمیز کرتا ہے تو جنگ کی حالت میں۔ لیکن جنگ کی حالت میں بھی اس نے جو حقوق اپنے دشمنوں کو دیئے ہیں وہ حقوق آج کوئی ملک اپنے دوستوں کو بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں اسلامی فقہ کے ان ابواب کو سامنے رکھا جائے جن میں فقہاء نے مستامنوں اور حربیوں کے عارضی اور مستقل قیام کے حقوق کی تفصیل کی ہے تو اسلامی قانون کی انسانیت دوستی اور بین الاقوامی ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ امام محمدؒ کی مشہور کتاب 'السیر الکبیر' کے دو اقتباسات جن کا تعلق محنت کش طبقہ سے ہے پیش کئے جاتے ہیں۔

ولو ان حربیا دخل دار الاسلام بأمان فاستاجر ارضا من ارض الخراج فزرعها، فخراج الارض علی صاحبها ولیس علی الذراع شئ [1]

اگر دشمن قوم کا کوئی آدمی عارضی طور پر اسلامی مملکت میں آئے اور کوئی خراجی زمین لے کر اس میں زراعت کرے تو اس کا ٹیکس اجیر پر نہیں بلکہ مالک زمین پر ہوگا (یعنی حکومت اس سے کوئی زراعتی ٹیکس نہیں لے سکتی)۔

پھر دوسری جگہ اس کی توضیح کرتے ہیں:

فان الخراج یجب علی المستاجر ولا یجب علی الاجر [2]

---

[1] السیر الکبیر: ج ۴: ص ۳۵۴

[2] ایضاً

اس لیے کہ زمین کی لگان اجیر پر نہیں بلکہ آجر پر عائد ہوتی ہے۔

کیا دنیا کے کسی مذہب میں یا موجودہ زمانہ کے کسی دستور میں اپنے دشمن ملکوں کے اجیروں اور مزدوروں کو یہ حقوق دیئے گئے ہیں؟ کاش دنیا کے موجودہ حکمران جو دن رات اپنے مصالح کے تحت بین الاقوامیت اور "پرامن بقائے باہمی" کے لیے چارٹر تیار کرتے اور ناوابستہ اصول وضع کرتے رہتے ہیں۔ اسلام کے اس وسیع اور عالمگیر اخلاقی نقطہ نظر پر غور کرتے تو واقعی طور پر دنیا میں بین الاقوامیت[1] اور پرامن بقائے باہمی کا منصوبہ شرمندۂ تکمیل ہو جاتا۔ اسلام کے بین الاقوامی نقطہ نظر کی اس تفصیل کے بعد اس وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ایک ملک کی کثیر آبادی کو معاشی ضرورتوں کے تحت دوسری جگہ منتقل کرنا اسلامی نقطہ نظر سے کیسا ہے مگر پھر بھی خلافت راشدہ کے چند تعامل کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

قرآن و حدیث میں مسلمانوں کو ہجرت (یعنی اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے مقام پر چلے جانے) پر بار بار ابھارا گیا ہے۔ اگرچہ ہجرت کے شرعی معنی دین کی خاطر وطن چھوڑنے کے ہیں مگر قرآن پاک میں اس کو معاشی خوشحالی کا بھی ایک سبب قرار دیا گیا ہے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً[2]

جو شخص خدا کی راہ میں وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جائے تو وہ خدا کی زمین میں بہت کچھ وسعت اور کشائش رزق پائے گا۔

اسی طرح حدیث میں دوسرے مقاصد کے لیے بھی وطن چھوڑنے کو ہجرت کہا گیا ہے۔ مثلاً

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب "اسلام اور بین الاقوامی تصورات"

[2] النساء : ۱۰۰

"لا ھجرۃ بعد الفتح الا جہاد ونیۃ"[1] کی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے کہ اخلاص نیت کے ساتھ اگر دوسری ضروریات کے لیے مثلاً تبلیغ طلب علم کے لیے کوئی شخص گھر چھوڑ کر نکلے تو وہ بھی ہجرت شمار ہوگی۔ اسی پر حصول رزق کے لیے وطن چھوڑنے کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن نے اس کو فضل خداوندی قرار دیا ہے۔ اور اس کے لئے حکم ہے کہ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں بہت سی نو آبادیاں مثلاً کوفہ، بصرہ، فسطاط وغیرہ قائم کیں اور وہاں بہت سے عرب قبائل کو جن کے معاش کا انتظام جزیرہ عرب میں مشکل تھا بھیج کر آباد کیا۔ اس بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ عمل کی وضاحت اس تقریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ایران کے مقابلہ کے لیے جانے والی فوج کے سامنے کی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ:

حجاز میں تمہارے قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ تم چارے کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے رہو اس لیے کہ یہاں معاش کا کوئی ذریعہ نہیں ہے[2]

اس سے آپ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک میں معاش کے ذرائع محدود ہوں تو آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ دوسری جگہ ان کی تلاش کرے۔

ایک بار کچھ قبائل آپ کے پاس آئے اور جہاد کی اجازت چاہی۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ کہاں جانا چاہتے ہو تو انہوں نے کہا کہ شام۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ شام کے بجائے عراق جاؤ۔

واستقبلوا اجہاد قوم قد حوّوا فنون العیش لعل اللہ ان یورثکم

---

[1] بخاری شریف: ۱: ۳۳۴ مطبوعہ کرزن پریس دہلی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری، مجمع بحار الانوار اور مفردات امام راغب

[2] یوسف الدین: اسلام کے معاشی نظریے: ص ۲۲۱۔

بقسطكم من ذلك فتعيشوا مع من عاش من الناس [1]

اس قوم سے جہاد کے لیے بڑھو جنہوں نے تمام ذرائع معاش پر قبضہ کر رکھا ہے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارا حصہ کا رزق پہنچائے گا اور تم بھی اس ملک کے باشندوں کی طرح اطمینان کی زندگی بسر کر سکو گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کے پیدا کئے ہوئے ذرائع رزق سے خود تو بیش از بیش فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے بے وسیلہ لوگوں کا کچھ خیال نہیں کرتے ہیں ان سے ذرائع رزق کو چھیننے کے لیے جنگ بھی کی جا سکتی ہے۔

ے جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس کی مزید توضیح حضرت خالدؓ کی ایک تقریر سے بھی ہوتی ہے جب وہ بلادِ عجم کا رخ کر رہے تھے تو انہوں نے مجاہدین کے سامنے یہ تقریر کی:

الا ترون الى الطعام كرفع التراب وبالله لو لم يلزمنا الجهاد فى الله والدعاء الى الله عز وجل ولم يكن الا المعاش لكان الرأى ان نقارع على هذا الريف حتى نكون اولى به [2]

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ یہاں ذرائع رزق اور سامانِ معیشت کا انبار لگا ہوا ہے۔ اللہ کی قسم اگر ہم پر جہاد اور دعوت و تبلیغ فرض نہ بھی ہوتی بلکہ محض طلب معاش کی ضرورت لاحق ہوتی تب بھی میں تم کو یہی مشورہ دیتا کہ اس سرسبز و شاداب علاقہ کے لیے ہم کو لڑنا چاہیے اور اس پر قبضہ کرنا چاہیے۔

---

[1] تاریخ طبری، صـ۲۱۰۸ تحت سنہ ۱۳ھ

[2] تاریخ طبری صـ۲۰۳۱ تحت سنہ ۱۳ھ

اس سے یہ نہ کہا جائے کہ کچھ لوگوں کو محروم کرکے دوسروں کو ان کے ذرائع رزق دیئے جائیں بلکہ بے وسیلہ بندگانِ خدا کو اس میں شریک کردیا جائے

غرض کتاب وسنت کی ہدایت اور اسوۂ صحابہؓ سے پیش نظر ابتدائی صدیوں میں مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں محض ذرائع رزق کی تلاش میں گئے اور وہاں آباد ہو گئے اسی طرح اسلامی ملکوں میں ہزاروں غیر ملکی بغیر کسی روک ٹوک کے حصول رزق کے لیے آئے اور بس گئے۔ کاش دنیا میں ایک بار پھر وہی دور آجاتا تو آبادی کی کثرت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے نہیں تو کئی صدیوں کے لیے حل ہو جاتا۔

حکومت کی ذمہ داری اور اس کے فرائض

مزدوروں اور غریبوں کے سلسلہ میں معاشرہ اور حکومت کی اخلاقی ذمہ داری کے تقریباً ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ اب محنت کش طبقہ کے بارے میں حکومت کی قانونی ذمہ داریوں اور فرائض کی وضاحت کی جائے گی۔

محنت کش طبقہ کے بارے میں اسلامی حکومت کی پالیسی، ذمہ داری اور اس کے فرائض ان سات بنیادی باتوں کے پیش نظر ہی متعین ہوں گے جو" اجرت کا اسلامی نقطۂ نظر" کے تحت بیان کی جاچکی ہیں۔ ان بنیادوں کے پیش نظر حکومت کی پہلی ذمہ داری یہ ہو گی کہ وہ ملک کے ہر باشندے کی بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرے اور ان کے جان ومال کی حفاظت کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کی اس ذمہ داری کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا تھا۔

انا ولی من لا وارث لہٗ۔

میں اس کا والی ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

یعنی جو لوگ ذرائع رزق سے بہرہ ور ہیں وہ تو اپنی کفالت کے خود ذمہ دار ہیں۔ مگر جو کسی وجہ سے ان سے محروم ہیں ان کی کفالت حکومت کے ذمہ ہے۔ آپ نے یہ اعلان حاکمانہ

حیثیت سے فرمایا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ سرکاری آمدنی سے ایسے لوگوں کی کفالت فرماتے تھے اور آئندہ کے لیے یہ ہدایت فرمادی کہ "السلطان[1] ولی من لا ولی لہ" حکومت اس کی کفیل ہے جس کا کوئی کفیل نہ ہو۔ اسی بنا پر فقہاء نے یہ کلیہ بنایا ہے کہ؛

الامام یعصموا النفس والمال۔

عوام کی جان ومال کی حفاظت امام (یعنی حکومت) پر ہے۔

مگر اس سلسلہ میں اسلامی حکومت کوئی جبری طریقہ اختیار نہیں کرے گی جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔ جہاں کوئی جبر کا پہلو دکھائی دیتا ہے اسے مخصوص حالات کا تقاضا سمجھنا چاہیے۔

موجودہ دور میں حکومت کا دائرہ اختیار گو بہت وسیع ہو گیا ہے مگر اس کی وسعت اور ساری تگ ودو حکومت کے کارکنوں کی آسائش اور حکومت کے انتظام وانصرام تک محدود ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی ناگہانی مصیبت، سیلاب، بیماری وبا وغیرہ کا حملہ ہو گیا تو اس صورت میں عارضی طور پر حکومت کی طرف سے عوام کی کچھ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ مگر عام حالات میں حکومت کو بہت کم اس سے غرض ہوتی ہے کہ کس کے گھر میں فاقہ ہو رہا ہے۔ کس بستی کی معاشی حالت اچھی اور کس کی بری ہے۔ مزدوروں کو کام کے مواقع ہیں یا نہیں۔ کسی ضرورت ناگہانی پر اگر ان کو قرض کی ضرورت ہوتی ہے تو ان کو کتنی دقت اٹھانی پڑتی ہے۔ ان کی آمدنی کا کتنا حصہ مہاجن کے سود میں چلا جاتا ہے اور کتنا بچتا ہے۔ اس سے اس کو نجات کیسے حاصل ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس حیثیت سے اجیروں کی طرف جن ممالک میں توجہ ہے بھی تو خود انہی کے پیسے اور انہی کی محنت کے ذریعہ سے جتنا انتظام ہو سکتا ہے کیا جاتا ہے۔ مگر ان کے پاس پیسہ نہ ہو یا وہ

---

[1] سلطان کا لفظ بادشاہ کے معنی میں کئی صدی بعد استعمال ہونے لگا ورنہ قرآن وحدیث میں یہ طاقت، قوت

محنت نہ کر سکتے ہوں تو پھر ان کی مستقل دیکھ بھال کے لیے کوئی مستقل فنڈ نہیں ہے۔ خود امریکہ میں اس پر غور کیا جا رہا ہے کہ عارضی بے کاری کے زمانہ میں مزدوروں کی گذر اوقات کا کیسے سامان ہو۔ (آج کا امریکہ، ۲۵ راگست ۱۹۵۰ء)

مگر مستقل بے کاروں کے لیے ابھی تک وہاں کوئی مستقل فنڈ نہیں قائم ہو سکا ہے۔ بر خلاف اس کے اسلامی حکومت کارکنوں کی آسائش و آرام اور حکومت کے انتظام و انصرام پر اس قدر زور نہیں دے گی کہ عوام کی ضرورتیں پس پشت پڑ جائیں۔

اسلامی حکومت میں یہ نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے ایک کارکن کے لیے تو ایک ایک لاکھ روپئے کے کوارٹر اور بنگلے تیار کئے جائیں اور وہیں پر پھاوڑا چلانے والے مزدوروں کو شام کے وقت آسودگی سے پیٹ بھر کھانے کی اُجرت بھی نہ مل سکے۔ اور رات کو سر چھپانے کے لیے کھلی ہوئی سڑک یا دوکان کی پٹڑی کے علاوہ کوئی جگہ نہ ہو، بلکہ اسلامی حکومت کے کارکنوں اور ذمہ داروں کا منصب اور مؤقف یہ ہوگا کہ:

لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (القصص: ۸۳)

یہ لوگ زمین پر بڑائی اور بگاڑ نہیں چاہتے۔

اَلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ۔ (الحج: ۴۱)

وہ تو ہیں ہی ایسے کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیدیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔

غرض یہ کہ حکومت اس لیے قائم نہیں ہوتی کہ اس کے کارکن عیش کریں اور عوام پر اپنا اقتدار جمائیں۔ بلکہ اس کا مقصد برائی کو دبانا فساد کو مٹانا اور بھلائی کو رواج دینا ہے۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے اسلامی حکومت کی سب سے بڑی برائی اور اس کا سب سے بڑا بگاڑ

یہ ہے کہ ملک کے کچھ لوگ تو داد عیش دیں اور بیشتر لوگ اپنی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہوں اور اس کو اس کی فکر نہ ہو۔ اسلام کارکنان حکومت کے ذہن میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ یہ عہدہ اور حکومت کی کرسی عیش و آرام کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ذمہ داری اور بوجھ ہے ایک بار حضرت ابو ذرؓ نے آپؐ سے کوئی عہدہ طلب کیا تو آپؐ نے فرمایا:

انت ضعیف وھی امانة[1] وھی یوم القیامة خزی وندامة الا من اخذھا بحقھا وادی ما علیہ فیھا۔

تم ایک کمزور آدمی ہو اور یہ ایک امانت ہے (جس کو اٹھانے کے لیے بڑا مضبوط دل و دماغ اور کردار کی ضرورت ہوتی ہے)۔ یہ قیامت کے دن اس شخص کے لیے رسوائی اور ندامت کا سبب بنے گی البتہ جس نے اسے حق کے ساتھ حاصل کیا اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کیا وہ بچ جائے گا۔

خلفائے راشدین میں سے ہر ایک نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا تھا۔ چنانچہ ان کی ان تقریروں سے اس کا پورا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد کی تھیں جسے طوالت کے خیال سے ہم یہاں نقل نہیں کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جب مشہور قحط عام الرمادہ پڑا تھا تو ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ ان کے خادم اسلم کہتے ہیں کہ اگر خدا نے اس سے جلد نجات نہ دے دی ہوتی تو حضرت عمر ہلاک ہو جاتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد جب ان کی اہلیہ سے لوگوں نے ان کے فضل و کمال کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

"خدا کی قسم وہ تم سے زیادہ نمازیں نہیں پڑھتے تھے اور نہ کثرت سے روزے

---

[1] قرآن کی آیت "ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا" میں امانت سے حکومت کی ذمہ داری بھی مراد لی گئی ہے۔ آپ کے اس ارشاد سے اس کی تفسیر ہو جاتی ہے۔

رکھتے تھے لیکن خدا کی قسم میں نے خدا کے کسی بندہ کو ان سے زیادہ خوفِ خدا رکھنے والا نہیں پایا "

پھر فرمایا:

کان رحمہ اللہ قد فرغ بدنہ ونفسہ للناس فکان یقعد لحوائجھم یومہ فاذا امسیٰ وعلیہ بقیۃ من حوائجھم وصلہ بلیلتہ۔

خدا ان پر رحمت کرے، انہوں نے اپنے جسم وجان کو پورے طور پر عوام کے کاموں میں لگا دیا تھا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ دن بھر عوام کی ضرورتوں میں لگے رہتے تھے۔ جب شام ہو جاتی اور کچھ کام باقی رہ جاتا تو رات کو اسے پورا کرتے تھے۔

پھر فرماتی ہیں کہ ایک دن انہوں نے حسبِ معمول اپنا کام شام کو ختم کر لیا تو گھر کا چراغ منگوایا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر اپنی ٹھوڑی سے ہاتھ ٹیک کر بیٹھ گئے اور صبح تک روتے ہی رہ گئے۔ میں نے پوچھا کہ رات کیا خاص بات پیش آگئی تھی کہ آپ اس قدر بے چین تھے آپ نے فرمایا کہ:

قد وجدتنی ولّیت امر ھذہ الامۃ اسودھا واحمرھا فذکرت الغریب القانع الضائع والفقیر المحتاج والاسیر المقھور واشباھھم فی اطراف الارض فعلمت ان اللہ تعالیٰ سئلنی عنھم وان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم حجیجنی فیھم فخفت ان لا یثبت لی عند اللہ عذر ولا یقوم لی مع محمد صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ فخفت علی نفسی [1]

آج مجھے اس خیال نے غم میں ڈال دیا کہ میں اس امت کا جس میں سیاہ و سفید ہر طرح

---

[1] کتاب الخراج صہ ۹۔

کے لوگ ہیں ذمہ دار بنا دیا گیا ہوں۔ تو میں نے جب یہ خیال کیا کہ ملک کے اطراف و جوانب میں نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے تنگدست مسافر، ضرورت مند، غریب اور مظلوم قیدی اور ان کے جیسے لوگ ہیں گے (جن کی ضرورتیں میں پوری نہ کرسکا ہوں گا) تو جب اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں مجھ سے پوچھیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارے میں مجھ سے جواب طلب کریں گے تو میں خدا کو کیا جواب دوں گا اور آپؐ کے سامنے کیا عذر پیش کروں گا۔ یہی خوف تھا جو آج مجھ پہ طاری رہا۔

یہ اس شخص کا حال تھا کہ جن کے زمانہ میں معاشی خوشحالی کا یہ حال تھا کہ ملک میں زکوٰۃ لینے والے نہیں ملتے تھے۔

غرض یہ کہ عوام اگر بھوکے ہوں گے تو ذمہ داران حکومت کا بھی خواب و خور حرام ہو جائے گا یہ نہیں ہوسکتا کہ لوگ تو فاقہ سے تڑپیں اور حکومت کے ذمہ دار رقص و سرود کی مجلسیں جمائیں

حکومت کی دوسری ذمہ داری اجیر و مستاجر کے حقوق و فرائض کی تعیین ہے۔ یوں تو اجیر و مستاجر کو اجرت کے سلسلہ میں معاہدہ اجرت کی پوری آزادی ہوگی مگر اجیر کو یہ حق ہوگا کہ وہ جو محنت اپنے لیے پسند کرے اختیار کرے اور جس شرط پہ چاہے مستاجر سے معاہدہ کرے۔ اسی طرح مستاجر کو یہ حق ہوگا کہ وہ جس مزدور کو چاہے اپنے یہاں کام پر رکھے اور جو اجرت چاہے مقرر کرے۔ مگر اس آزادی کے باوجود حکومت چند باتیں اصولی طور پہ طے کرے گی۔ جن کی پابندی دونوں کو لازمی ہوگی۔

۱۔ ان کو کم از کم اتنی اجرت دی جائے کہ ان کی ضروریات آسانی کے ساتھ پوری ہوسکیں ضروریات زندگی کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

۲۔ ان کے کام کا وقت متعین ہو۔ مگر اس وقت میں بھی ان سے اتنا کام اور ایسا کام نہ لیا جائے جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو، وہ کام عام حالات میں آدمیوں سے نہ لیا جاتا ہو یا

جن کی وجہ سے ان کی صحت اور قوت کار پر جلد برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہو۔

۳۔ مدت ملازمت میں بیماری کی دیکھ بھال اور علاج کی ذمہ داری متاجر پر ہوگی۔

۴۔ مزدور سے سہواً یا اچانک کوئی غلطی یا نقصان ہو جائے تو اس پر کوئی باز پرس نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اگر اس نے قصداً کوئی نقصان کیا ہے تو متاجر کو یہ حق ہو گا کہ وہ اس سے اس کا تاوان وصول کرے۔ اگر وہ تاوان ادا نہ کر سکے تو یہ حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ مزدور کی طرف سے خود تاوان ادا کرے۔

۵۔ اگر کام کے درمیان میں مزدور کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اس کی تلافی متاجر کو کرنی پڑے گی۔ اس کی کوئی متعین صورت نہیں بتائی جا سکتی۔ اس کی تعیین حالات اور حادثہ کی کیفیت و کمیت کے مطابق ہی متعین ہوگی۔

۶۔ کسی مزدور کو کم اور کسی کو زیادہ اجرت دینے کا متاجر کو حق ہوگا۔ مگر کمی کی حد مقرر ہوگی۔

۷۔ اگر مزدور کام میں سستی کرے یا دل نہ لگائے تو متاجر کو اس کی اجرت میں کمی کر دینے کا حق ہوگا۔ اور اگر اس کا رکھنا اس کے لیے نقصان دہ ہو تو وہ علیحدہ بھی کر سکتا ہے۔ مگر علیحدہ کرنے سے پہلے اس کو سمجھانے بجھانے اور کام کی رغبت پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کرنی ضروری ہوں گی۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ یہ چیز کسی عذر یا بددلی کی وجہ سے ہو۔

۸۔ محض نفع کی کمی یا معمولی نقصان کی بنا پر مزدور کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ یا تو وہ مزدور کو خود اس پر راضی کرے یا متاجر حکومت کے سامنے اس کو علیحدہ کرنے کی وجوہ بیان کر کے اس کے لیے اجازت حاصل کرے۔

یہ اصول طے کر دینے کے بعد حکومت کا کام ختم نہیں ہوتا بلکہ ان اصولوں پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے یا نہیں اس کی نگرانی کے لیے حکومت ایک "مزدور نگران" محکمہ قائم

کرے گی جو ہر وقت اس بات کی نگرانی کرتا ہے گا کہ مزدوروں پر کوئی زیادتی تو نہیں ہو رہی ہے، مزدوروں اور مالکوں میں کوئی کشمکش تو نہیں پیدا ہو رہی ہے۔ اس محکمہ کے متعلق حسب ذیل کام ہوں گے۔

۱۔ کوئی مستاجر اجیر پر زیادتی تو نہیں کر رہا ہے۔ یہ زیادتی دو طرح کی ہو سکتی ہے ایک اجرت کی کمی کی، دوسرے کام کی زیادتی کی۔ ان دونوں صورتوں میں محکمہ کے ذمہ داروں کا کام یہ ہو گا کہ وہ اس کا دفعیہ کریں۔ امام ابو یعلیٰ محتسب[۱] کے فرائض کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واذا تعدی مستاجر علی اجیر فی نقصان اجرا واستزاد عمله کفه عن تعدیه

جب کوئی مستاجر اجیر پر (کام کی) زیادتی یا اجرت کی کمی کے سلسلہ میں زیادتی کرے تو یہ زیادتی سے روکے۔

اگر مستاجر اجیر کی شکایت کو غلط قرار دیدے یا اس سے انکار کرے تو اس کا انکار کرنا کافی نہیں، بلکہ اس کا انکار اس وقت معتبر ہو گا جب مزدور کے حالات اور دوسرے ذرائع سے اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے۔

وکان الانکار معتبرا بشواهد حاله۔

مستاجر کا انکار مزدور کے حالات کے اندازے کے بعد معتبر ہو گا۔

۲۔ اسی طرح اگر کوئی اجیر کام میں کوتاہی کرے یا اجرت معاہدہ یا حکومت کے مقرر کردہ معیار سے زیادہ اجرت مانگے تو اس کو وہ اس سے روکے گا اور اس کو تنبیہ کرے گا۔

---

[۱] اسلامی حکومت میں یہ کام محکمہ احتساب انجام دیتا تھا مگر مزدوروں کے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا جا سکتا ہے جیسا کہ آج کل جمہوری ملکوں میں ہے۔

ولو قصر الاجیر فی حق المستاجر فنقصہ من العمل او استزادہ فی الاجر منعہ منہ [1]

اجیر اگر مستاجر کے حق میں کوئی کوتاہی کرے یعنی کام کم کرے یا مقررہ معیار سے اجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی اس سے روکا جائے گا۔

اگر اس محکمہ کے ذمہ داروں کی تنبیہ اور ہدایت کے بعد بھی وہ باز نہ آئیں یا آپس میں کشمکش کریں تو فوراً یہ معاملہ سول کورٹ کے سپرد کر دیا جائے گا اور وہ اس بارے میں اپنی صواب دید کے مطابق فیصلہ کرے گی۔

فان اختلفوا وتناکروا کان الحاکم بالنظر بینھما احق [2]

جب آپس میں اختلاف اور کشمکش زیادہ ہو تو یہ معاملہ حکومت کی عدالت کے سپرد ہو گا۔

سول کورٹ فیصلہ کرنے میں اسلام کا یہ مسلمہ اصول پیش نظر رکھے گی"

لا یظلمون ولا یظلمون نہ وہ خود ظلم کرتے ہیں اور نہ ان پر ظلم کیا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔

لا ضرر ولا ضرار۔

نہ نقصان اٹھانا صحیح ہے اور نہ نقصان پہنچانا۔

اس کے پیش نظر فقہاء نے یہ اصول بنایا ہے۔

الضرر یزال۔

---

[1] ابو یعلی الاحکام السلطانیہ: ص ۲۸۶

[2] ایضاً، ماوردی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ یعنی کش مکش کا فیصلہ اس محکمہ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو گا۔ اس کا فیصلہ یا تو سپریم کورٹ میں ہو گا یا پھر کوئی مخصوص عدالت اس کے لیے [illegible] کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے گی۔

تکلیف اور نقصان حتی الامکان دور کیا جائے گا۔

اسی طرح حکومت کے مذکورہ طے کردہ اصولوں میں سے جس کسی اصول کی بھی مخالفت کوئی فریق کرے گا تو حکومت اس میں مداخلت کر کے اس کا منصفانہ تصفیہ کرے گی۔ وہ تماشائی بن کر دونوں کی کشتی نہیں دیکھے گی۔

اس محکمہ کے سپرد صرف انہیں مزدوروں کے حقوق کی نگرانی نہیں ہوگی جو کسی کارخانہ یا سرکاری محکمہ میں ملازم ہیں بلکہ ذاتی ملازموں، اہل پیشہ اجیروں، صناعوں، معلموں طبیبوں اور محنت کش جانوروں کے حقوق کی حفاظت بھی اس کے دائرہ اختیار میں ہوگی۔ امام ابویعلیٰ نجی ملازموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر کوئی آقا اپنے ملازم یا خادم سے اتنا کام لے جس کو وہ ہمیشہ نہ کر سکے تو پھر مزدوروں کے نگراں کا فرض ہے کہ اس سے وہ آقا کو بطور نصیحت روکے یہ تو اس صورت میں ہے کہ جب نگران خود محسوس کرے[1] اور اگر ملازم خود شکایت کرے تو پھر سختی کے ساتھ ممانعت کرے۔"

اگر جانوروں کے مالک ان سے ایسا کام لیں جو عموماً ان سے نہ لیا جاتا ہو یا جس کو وہ دواماً نہ کر سکتے ہوں تو سختی سے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر مالک یہ کہے کہ یہ جانور یہ کام کر سکتا ہے اور یہ کام اس کی قوت سے باہر نہیں ہے تو اس کے کہنے پر اعتماد نہ کرے بلکہ خود اس کا امتحان اور اندازہ کر کے کوئی فیصلہ کرے[2]

اوپر اجیروں کی ایک قسم اجیر مشترک کے حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کی نگرانی بھی اس محکمہ کے سپرد ہوگی۔ اجیر مشترک عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔

---

[1] اس فرق کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

[2] ابویعلیٰ: الاحکام السلطانیہ: ص ۲۸۹۔

۱۔ ایک وہ جن کے کام میں افراط و تفریط کا اندیشہ ہو۔ مثلاً ڈاکٹر، طبیب وغیرہ ان کے بارے میں بھی یہ نگرانی کی جائے گی کہ یہ علاج میں کوئی کوتاہی تو نہیں برت رہے ہیں۔ اسی طرح معلمین پر اس حیثیت سے نظر رکھی جائے گی کہ ان کی تعلیم و تربیت کا اثر بچوں پر برا تو نہیں پڑ رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان کو ہٹا کر لائق لوگوں کو اس پر مقرر کیا جائے گا طبیب لوگوں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے کہ:

ومن تطبب ولم يعلم منه طب قبل ذلك فهو ضامن [1]

جو علاج و معالجہ سے پہلے سے واقف نہ ہو اور علاج کی کوششیں کرے تو وہ نقصان کا ضامن ہو گا۔ یعنی ڈاکٹروں اور طبیبوں کو انسانی زندگی سے کھیلنے کا موقع نہیں دیا جائے گا"

۲۔ دوسرے وہ لوگ جنکے کام میں خیانت و دھوکہ کا اندیشہ ہو۔ مثلاً سنار، بڑھئی، دھوبی رنگریز اور درزی اور دوسرے اہل پیشہ۔ ان لوگوں کی نگرانی دو حیثیت سے کی جائے گی۔ ایک یہ کہ لوگوں کے مال میں وہ خیانت تو نہیں کر رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص خائن نظر آئے تو اس کو متعلقہ افسر اس کام سے روک دے اور اس کی جگہ کسی امانت دار کو کام کے لیے مقرر کرے۔ اور پھر ان کی بد دیانتی کو کافی مشتہر بھی کر دے تاکہ لوگ اس کے دھوکہ میں نہ آویں مثلاً کوئی سنار سونا چرا لیتا ہے یا اس میں ملاوٹ کر لیتا ہے۔ دھوبی کپڑے غائب کر کے چوری کا بہانہ کر دیتا ہے تو ایسے لوگوں کو وہ پیشہ کرنے سے اس وقت تک روک دے گا جب تک ان کی اصلاح نہ ہو جائے۔ پھر ان لوگوں کی نگرانی اس حیثیت سے بھی کی جائے گی کہ وہ لوگوں

---

[1] ابویعلیٰ الاحکام السلطانیہ: ص ۲۸۷

کا کام خراب تو نہیں کر رہے۔ خواہ کام خراب کرنے کی شکایت اس کے پاس پہنچے یا نہ پہنچے۔ اگر کوئی پیشہ ور اس کا عادی ہو جائے تو اس پر داروگیر کرنے اور اگر ضرورت ہو تو اس کو عدالت کے سپرد کر کے اس پر جرمانہ عائد کرانے کی بھی اجازت ہے۔

حصر یہ کہ ہر پہلو سے اجیروں، مزدوروں، ملازموں اور محنت کش جانوروں کی وہ نگرانی کرے تاکہ نہ تو ان کی حق تلفی متاجر و مالک کر سکیں اور نہ وہ کسی کی حق تلفی کر سکیں۔

کیا ان حقوق و فرائض اور تحفظات کے بعد مسئلہ اجرت میں سرمایہ دارانہ جمہوریت کی بے قیدی کی اور اشتراکی جبر و تشدد کی وہ تمام مضرتیں دور نہیں ہو جاتیں جن کی وجہ سے مزدوروں کی محنت کا پھل یا تو سرمایہ دار کھاتا ہے یا حکومت کے کارندے۔ کیا دنیا کے اندر مسئلہ اجرت کا اس سے زیادہ منصفانہ معتدل اور اخلاق و قانون کے امتزاج کا نظام موجود ہے۔

بیت المال کی پشت پناہی

موجودہ دور میں جمہوری ممالک ہوں یا اشتراکی ہر جگہ مزدوروں کے لیے جو اسکیمیں بنائی جاتی ہیں ان میں صرف اتنی بات پر اکتفا کیا گیا ہے کہ اگر ان کے اندر محنت کی صلاحیت باقی نہ رہے یا وہ مستقل طور سے بے کار ہو جائیں یا ان کو کوئی ہنگامی حادثہ یا ضرورت پیش آجائے تو ان کو اس وقت تک تو مدد مل سکتی ہے جب تک ان کی پنشن فنڈ یا انشورنس فنڈ میں رقم موجود ہے۔ اس کے بعد حکومت اس کی غیر معمولی حالت میں کچھ دنوں تک مدد کرتی ہے مگر اس کے لیے کوئی ایسا مستقل فنڈ نہیں ہوتا جس سے حاجت مند اور بے سہارا لوگوں کی ہر آڑے وقت پر مدد کی جا سکے اور وہ اس کو بطور حق لے سکیں وہ محض حکومت کا رحم و کرم نہ ہو۔ جس جگہ مزدوروں کے سوشل انشورنس اور پنشن کا مستقل طریقہ جاری ہے اس سے ایک محدود طبقہ کو فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اگر اس کو کوئی ناگہانی ضرورت پیش آجائے تو پھر حکومت کے پاس کوئی ایسا فنڈ نہیں ہوتا جس کے ذریعہ ان کی بے کاری دور کی جا سکے۔ امریکہ میں جہاں

مزدوروں کا معیارِ زندگی سب سے زیادہ بلند ہے اس کی امدادی اسکیموں کا ذکر آ چکا ہے۔ یونائیٹڈ انفارمیشن کی طرف سے ۲۵ راگست ۱۹۵۵ء کو جو ہفتہ وار بلیٹین شائع ہوا ہے اس کی مزدوروں کی امداد کی کچھ نئی اسکیمیں ملاحظہ ہوں۔

"اگر مرکزی سرکار نے منظوری دیدی تو نئے معاہدہ کے تحت جس مزدور کو کام سے ہٹایا جائے گا وہ بے کاری کے دوران اپنے پنشن فنڈ کے حساب میں سے چالیس ڈالر فی ہفتہ تک حاصل کر سکے گا۔ اس رقم میں حکومت کی طرف سے ملنے والا بے کاری بھتہ بھی شامل ہوگا اسے ۲۶ ہفتے تک یہ مراعات حاصل ہو سکیں گی۔ اس کے بعد بھی اگر کمپنی نے اسے واپس نہ لیا تو کمپنی کو اسے مزید ۲۶ ہفتوں تک ۴۰ ڈالر فی ہفتہ ادا کرنے ہوں گے۔" (آج کا امریکہ ۲۵ راگست ۱۹۵۵ء)

اس سے معلوم ہوا کہ جو مزدور اپنی اجرت کا ایک حصہ برابر کٹاتا رہے اس کو بیکاری کے زمانہ میں اس کی پس انداز کی ہوئی رقم میں حکومت کچھ اپنی مدد شامل کر کے محض ۲۶ ہفتوں تک مدد دیگی۔ اس کے بعد پھر مزدور کو کارخانہ دار نے نہ رکھا تو حکومت اس میں اتنی مداخلت کر سکتی ہے کہ وہ ۲۶ ہفتے تک اس کی اور مدد کرا دیگی گویا اسکے بعد حکومت، معاشرہ اور کارخانہ دار سب کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا کوئی قانونی حق نہیں رہتا جس کا وہ مطالبہ کر سکے۔ یہ حکومت کا احسان ہوگا کہ وہ اس کی کچھ مدد کر دے۔ پھر یہ رقم جو اس کو بے کاری کے زمانہ میں ملے گی وہ بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر امریکہ کے معیارِ زندگی کو سامنے رکھا جائے تو اس رقم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

غرض یہ کہ مزدوروں کے سلسلہ میں جو زیادہ سے زیادہ مدد کی صورتیں وہاں سوچی گئی ہیں وہ یہی ہیں۔ وہ بھی ابھی مرکزی سرکار کی منظوری پر موقوف ہوگی۔

اس کے برخلاف اسلام نے جو اسکیمیں اس سلسلہ میں بتائی ہیں ان میں یہ عیوب

نہیں ہیں۔

اسلامی حکومت کے مالیات کا ایک مستقل ذریعہ آمدنی زکوٰۃ ہے۔ اس ذریعہ سے جو آمدنی ہو گی اس کا بیشتر حصہ مزدوروں، بے روزگاروں اور ضرورت مندوں کے لیے مخصوص ہو گا۔

اس فنڈ سے ہر حاجت مند بطور حق مدد اور قرض[1] لے سکتا ہے۔ اور اس کو اس کی ادائیگی میں نہ تو سود کا بار اٹھانا پڑے گا اور نہ اس کی جائیداد نیلام کی جائے گی مفلسوں کے لیے اس کی ادائیگی ضروری بھی نہیں ہو گی۔

پھر یہ فنڈ مزدوروں کی اجرت اور کم آمدنی والوں کی قلیل تر آمدنی سے کاٹ کر نہیں بلکہ سرمایہ داروں کے بڑھے ہوئے منافع سے فراہم کیا جائے گا۔ گویا ان کو جو کچھ دیا جائے گا ان کی جیب سے نہیں بلکہ دولت مندوں اور آسودہ حال لوگوں کی جیب سے لے کر ان کو دیا جائے گا۔

توخذ من اغنیاءکم وترد علی فقرائکم[2]

تمہارے دولتمند سے لے کر غریبوں کو دیا جائے گا۔

---

[1] فاضل مصنف کی یہ رائے اسلامی فقہ کی رو سے محل نظر ہے۔ کیا زکوٰۃ فنڈ سے مزدوروں یا حاجتمندوں کو قرض دیا جائے گا یا ان کی مدد بطور انکے حق کی جائے گی جو ان کا اموال الزکاۃ میں ہوگا۔ فقہاء احناف نے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے جو تملیک (full possession.) کی شرط عائد کی ہے وہ زکوٰۃ فنڈ سے محتاج کو قرض دے کر پھر واپس لینے میں کسی طرح پوری نہیں ہو گی۔ دوسرے زکوٰۃ تو ہے ہی انہی محتاجوں کے لیے پھر قرض حسنہ ان کو دینا کیسے ہوا؟ البتہ اسلام کے معاشی نظام میں ایسے نظائر ملتے ہیں۔ کہ جہاں اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ محتاج لوگوں کی کفالت کرے۔ اور حاجتمندوں کو بیت المال سے قرض حسنہ دے اس کے لیے موجودہ دور کی حکومتیں چاہیں تو کفایت عامہ فنڈ (Social Security Fund.) قائم کر سکتی ہیں۔

[2] ترمذی: ۱/۱۱۷ مطبوعہ نور محمد کراچی۔

اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دولت چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں سمٹنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں پھیلے

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ۔

تاکہ دولت سرمایہ داروں میں ہی گردش نہ کرتی رہ جائے۔

بعض لوگ یہاں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جن ممالک کے باشندوں میں مشکل سے ۵ یا ۱۰ فیصدی لوگ سرمایہ دار ہیں ان کی زکوٰۃ سے اتنی رقم حاصل نہیں ہو سکتی کہ ان سے ۸۰ یا ۹۰ فیصدی غیر سرمایہ داروں کی مدد کی جا سکے؟ مگر یہ سوال لوگ یا تو کسی غلط فہمی کی بنا پر کرتے ہیں یا پھر عوام کو اسلامی نظام سے متنفر کرنے کے لیے قصداً ایسا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہندوستان کو لیجیے۔ یہاں کی کل قومی آمدنی ۱۲ کھرب سے زیادہ ہے۔ اب اگر ۷۵-۸۰ فیصدی آمدنی ان سرمایہ داروں کی قرار دی جائے جو پوری آبادی کا ۱۰ یا ۱۵ فیصدی ہیں تو تقریباً ۱۰ یا ۲۰ ارب زکوٰۃ کی رقم ان کی آمدنی سے حاصل ہوگی۔ اگر ملک میں حاجت مندوں کی تعداد ایک کروڑ قرار دی جائے تو ان کو اس فنڈ سے سالانہ بارہ سو روپیہ فی کس مدد دی جا سکتی ہے[1] اور اگر اس رقم سے ان کو چھوٹی گھریلو صنعتوں[2] میں

---

[1] پاکستان سے زکوٰۃ کے ذریعے غربت اور محتاجی کے خاتمہ کے لیے باقاعدہ ایک اندازہ تیار کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے پاکستان میں ۵ لاکھ خاندان ایسے ہیں جنہیں زکوٰۃ یا مالی امداد کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر ایک خاندان کو ۵۰۰ روپے ماہوار دیئے جائیں تو تقریباً ۳ بلین روپے کی ضرورت ہوگی اور ۸۲-۱۹۸۱ء میں زکوٰۃ سے تقریباً ۰.۹ ملین اور عشر سے ۱.۵ ملین متوقع آمدنی تھی۔ گویا کہ ۳ ملین سے صرف ۵ بلین کم۔ لیکن ۸۴-۱۹۸۳ء میں زکوٰۃ اور عشر سے یہ آمدنی ۳ ملین سے بھی زیادہ ہو گئی۔ یہ اندازہ تو صرف اس حال میں ہے جب زکوٰۃ و عشر کا نظام پوری طرح لاگو نہیں کیا جا سکا۔ پھر بھی خاتمہ غربت کے لیے اتنا نظام ہی کافی ہے۔ اگر پورے طور پہ یہ نظام اللہ کرے رواج میں آجائے تو پھر کوئی غریب نہیں ہوگا۔

[2] فاضل مصنف کی یہ رائے کہ زکوٰۃ کی رقم کو چھوٹی صنعتوں میں لگایا جائے اور ان کے نفع سے غرباء کی

لگا دیا جائے تو لاکھوں آدمیوں کو ہر سال روزگار فراہم کیا جا سکتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اسلامی خزانہ کا ایک مستقل فنڈ محض مزدوروں، غریبوں اور حاجتمندوں کی امداد کے لیے مہیا ہوگا۔ یوں حکومت دوسرے ذرائع سے بھی ان کی مدد کرے گی۔ مگر یہ فنڈ ان کا سوشل انشورنس فنڈ ہوگا جس سے وہ جس وقت چاہیں بطور حق اپنی جائز ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ اور اس فنڈ کی ساری آمدنی ان کی جیب سے نہیں بلکہ سرمایہ داروں کی جیب سے حاصل کی جائے گی۔

غیر سودی قرضوں کا انتظام

موجودہ دور میں تقریباً تمام حکومتوں نے غریبوں ناداروں اور بے وسیلہ لوگوں کو حکومت کے خزانہ سے قرض دینے کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ مگر عملاً حکومت کی طرف سے قرضے کا انتظام اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی ارضی یا سماوی افتاد پڑ جائے۔ مثلاً قحط پڑ جائے، سیلاب آجائے تو حکومت قحط زدہ اور سیلاب زدہ لوگوں کو قرض کی سہولتیں دیتی ہے۔ لیکن اگر اس کو کوئی ہنگامی ضرورت پیش آجائے تو اس کے لئے حکومت کا خزانہ بند ہے۔ اسکو اگر اپنی لڑکی کی شادی کرنی ہو، اپنے

(بقیہ حاشیہ) مدد کی جائے۔ محل نظر ہے کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی اس طرح نہیں ہوگی۔ اس رائے کا جواز فقہ کے کسی مسلمہ مکتب فکر (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے ہاں نہیں ملتا۔ زکوٰۃ تو غریبوں کا مال ہے ان کے سپرد کر دیجئے انہیں اس میں ملکیت تامہ کے اختیارات دیجیے۔ وہ اپنے حصہ زکوٰۃ کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ اپنی عزبت کا علاج جیسے چاہیں کریں۔ سرمایہ کاری یا کسی اور ذریعہ سے انکے زکوٰۃ میں حق ملکیت پر کوئی قدغن لگانا زکوٰۃ کی شرعاً ادائیگی میں رکاوٹ ہوگی۔ جو صنعت آپ زکوٰۃ کی رقم سے قائم کریں گے وہ کس کی ملکیت ہوگی؟ غرباء کی؟ کس غریب کی؟ یا حکومت کی؟ حکومت تو زکوٰۃ کی مالک ہی نہیں۔ تو وہ زکوٰۃ کی صنعت یا فیکٹری کی مالک کیونکر بن سکتی ہے حکومت اموال زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم میں وکیل کا درجہ رکھتی ہے اور وکیل اپنے اختیارات میں موکل کا محتاج ہے کہ مؤکل وکیل کا محتاج بن جائے۔

بچے کی تعلیم کا انتظام کرنا ہو۔ اس کے گھر میں موت ہو جائے اور اس کے پاس پیسہ نہ ہو تو اس کو بہر حال ان مہاجنوں کے پاس دوڑنا پڑے گا جن کے جال میں پھنسنے کے بعد وہ نکل نہیں سکتا۔ پھر حکومت جو قرض حسنہ ضرورتوں کے لیے دیتی ہے وہ سب سودی قرضے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غریبوں اور ناداروں کو اگر مہاجنوں کے سود سے نجات ملی تو حکومت کے سود سے واسطہ پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایک ہزار روپیہ بنک سے دس سال کے لیے قرض لے تو اس کو کم سے کم تین فیصدی سالانہ سود بھی ادا کرنا ہوگا۔ اس طرح اس کو دس برس میں اصل کے ساتھ کم از کم گیارہ سو تیس روپے مزید ادا کرنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایک بے وسیلہ غریب اور مزدور پیشہ آدمی جس کے لیے اصل روپیہ کی ادائیگی ہی ایک مسئلہ ہے۔ اس کے لیے سود کی اتنی رقم کی ادائیگی کتنا زیادہ بار ثابت ہوگی۔

اس کے برخلاف اسلام انسان کی ہر جائز ضرورت کے لیے بلا سودی قرض کا انتظام کرتا ہے۔ خواہ وہ ضرورت غم و مسرت کی ہو یا معاشرتی و معاشی ہو۔ اس کے لیے وہ معاشرہ کو بھی تیار کرتا ہے اور حکومت پر بھی اس کی ذمہ داری ڈالتا ہے۔ حکومت کے بیت المال کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ عام لوگوں کے حادثات میں کام آئے۔

لان مال بیت المال معد لنوائب المسلمین [1]

---

[1] ہدایہ ۲: ۵۷۶ طبع لکھنؤ۔ یہاں مسلمانوں کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ غیر مسلموں کے لیے اس کا دروازہ بند ہے۔ آگے ذکر آئے گا کہ غیر مسلموں کے لیے بیت المال کا دروازہ اسی طرح کھلا ہے جس طرح ایک مسلمان کے لیے۔ یہاں ایک خاص موقع و محل کی وجہ سے مسلمان کے لفظ کا ذکر کیا گیا ہے۔

بیت المال کا روپیہ مسلمانوں کی ناگہانی ضرورتوں کے لیے ہے

ابتدا میں جب اسلامی حکومت کا خزانہ خالی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرض داروں کے قرض کا بار زیادہ تر معاشرہ کے خوشحال افراد پر ڈال دیتے تھے۔ مگر جب اسلامی خزانہ خود اس بار کے اٹھانے کے قابل ہو گیا تو آپ نے عام اعلان فرما دیا کہ یہ ذمہ داری حکومت پر ہے۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یؤتی بالرجل المتوفی علیہ الدین فیسأل هل ترك لدينه فضلا فان حدث انه ترك لدينه وفاءً صلى والا قال للمسلمين صلوا على صاحبكم فلما فتح رسول الله صلى الله عليه وسلم الفتوح قال انا اولى بالمومنين من انفسهم فمن توفى من المومنين من ترك دينا فعلى قضائه ومن ترك ما لا فلورثته [1]

ابتدا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کسی مقروض مردہ کا معاملہ پیش ہوتا تو آپ اس کے ورثہ سے دریافت فرماتے کہ کیا اس نے قرض ادا کرنے کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟ اگر اس نے کچھ چھوڑا ہے جس سے اس کا قرض ادا کیا جا سکے تو آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے تھے ورنہ فرماتے تھے کہ اپنے بھائی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ لیکن خدا نے جب فتح نصیب کی اور بیت المال میں روپیہ آنے لگا تو آپ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خود ان سے بھی زیادہ ذمہ دار ہوں۔ جس

---

[1] بخاری ۱: ۳۰۸ مطبوعہ کرزن پریس دھلی۔ مقروض کے جنازہ کی نماز صرف اس لیے نہیں پڑھاتے تھے کہ لوگ قرض لینے اور لے کر اسے نہ ادا کرنے سے گریز کریں۔

نے قرض چھوڑا اس کی ادائیگی کی ذمہ داری میرے اوپر یعنی بیت المال پر ہے۔ اور اگر اس نے ترکہ چھوڑا ہے تو وہ اس کے ورثاء کا ہے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وھٰکذا یلزم المتولی لامر المسلمین ان یفعلہ

اسی طرح جو بھی مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار ہو وہ ایسا ہی کرلے۔

یہی نہیں بلکہ اگر حکومت ایسا نہ کرے تو اس کی قانونی و اخلاقی ذمہ داری حکومت کے کارکنوں پر ہوگی اور وہ ایک گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

فان لم یفعل فالاثم علیہ [1]

اگر حکومت کا ذمہ دار ایسا نہ کرے تو اس کا گناہ اس کے اوپر ہوگا اور حکومت کے ذمہ دار جب گناہ کے دائرہ میں اپنا قدم رکھ دیں تو پھر عوام کو یہ حق ہوگا کہ وہ ان کو بدل کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ لے آئیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کا قرض لے کر ادا نہ کر سکے تو حکومت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اگر کوئی فضول خرچی کی بناء پر مقروض نہیں ہوا ہے تو اس کا قرض وہ خود ادا کر دے۔ ہاں اگر اس نے یہ قرض کسی ایسی ضرورت کے لیے لیا ہے جو ناگزیر ضرورت نہیں قرار دی جا سکتی تو پھر حکومت پر اس کی ذمہ داری نہ ہوگی۔ مگر ایسے آدمی کو بھی وہ معلق نہ چھوڑ دے گی۔ اگر آئندہ کے لیے وہ اپنی روش کی اصلاح کر لیتا ہے تو اس

---

[1] فتح الباری، ج ۴، ص ۳۹۱۔

کا یہ بار حکومت ہلکا کرے گی۔

مثلاً اگر کسی شخص کو تجارتی اغراض کے لیے قرض کی ضرورت ہو تو وہ بیت المال سے قرض لے سکتا ہے۔ ہند بنت عتبہ، عبداللہ بن عمرو اور عبیداللہ بن عمر وغیرہ نے کئی ہزار کی رقمیں بیت المال سے قرض لیں [1]

اسی طرح اگر کسی کو کھیتی باڑی کے لیے قرض کی ضرورت ہو تو بیت المال سے قرض لے سکتا ہے۔ چنانچہ معاشی نظریے کے مصنف نے صاحب فتح القدیر کی یہ رائے نقل کی ہے۔

"اگر کاشتکاروں کے پاس کاشت کے لیے رقم نہ ہو تو زرعی تعاون کے طور پر حکومت کی طرف سے کسانوں کو قرضے دینے چاہئیں" [2]

اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اسوۂ سے مزید توضیح ہوتی ہے۔ انہوں نے عراق کے امیر عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو ایک بار لکھا کہ:

"لوگوں کو جو وظیفے دیئے جاتے ہیں وہ جلد ان کو دے دیئے جائیں"۔

انہوں نے اطلاع دی کہ ان سب کے وظیفے دے دیئے گئے مگر بیت المال میں اب بھی رقم موجود ہے۔ آپ نے لکھا کہ:

ان انظر من اوان فی غیر سفه ولا سرف فاقض عنه۔

---

[1] تاریخ طبری، ص ۲۷۶۶ تحت سنہ ۲۳ھ

[2] اسلام کے معاشی نظریے ج ۲ ص ۵۲۵۔

ان مقروضوں کو ڈھونڈھ کر ان کا قرض ادا کرو جو فضول خرچی اور بے کار اور بے مقصد ضرورتوں میں مقروض نہ ہوئے ہوں۔

انہوں نے اطلاع دی کہ ان کے قرضے ادا کرنے کے بعد بھی خزانہ میں رقم موجود ہے۔ آپ نے پھر لکھا ہے کہ:

أن انظر كل بكر ليس لهُ مال فشاء ان تزوجه فتزوجه واصدق عنه۔

اگر کوئی نوجوان پیسے کے نہ ہونے کی وجہ سے شادی نہ کر سکتا ہو اور وہ شادی کرنا چاہے تو ایسے نوجوان کو تلاش کر کے ان کی شادی کا سامان بیت المال سے کردو اور ان کا مہر بھی بیت المال سے ادا کردو۔

عبدالحمید نے لکھا کہ میں نے عراق میں ایسے تمام لوگوں کی شادی کا انتظام کر دیا اس کے بعد بھی بیت المال میں رقم موجود ہے۔ آپ نے ان کو لکھا کہ:

"ان غیر مسلموں کو تلاش کرو جن پر سرکاری ٹیکس عائد ہے۔ اور اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے زمین سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے ایسے تمام لوگوں کو بیت المال سے قرض دو تاکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی کھیتی باڑی کا سامان درست کرلیں اور ان سے ایک یا دو سال کوئی ٹیکس نہ لیا جائے"۔ [1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس فرمان سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

---

[1] کتاب الاموال ص ۲۵۱۔

۱۔ سب سے پہلی بات جو اس سے معلوم ہوئی وہ اسلامی اور غیر اسلامی حکومت کے طریقہ کار کا بنیادی فرق ہے۔ عام حکومتوں کی طرح اسلامی حکومت کی ذمہ داری بس اتنی ہی نہیں کہ وہ کسی عارضی یا ہنگامی ضرورت میں عوام کو کچھ مدد یا قرض دے۔ یا اگر وہ تجارتی یا زراعتی قرض کے لیے درخواست دیں تو کئی دن دفتر کی خاک چھاننے اور سینکڑوں روپے رشوت دینے کے بعد ان کو جو تھوڑا سا سودی قرضہ ملے وہ اس کے لیے مدد کے بجائے ایک بار ثابت ہو۔ بلکہ اسلامی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ لوگوں کی ضرورتوں کو خود معلوم کرے اور معلوم کرکے ان کو پورا کرے۔ ان کو اس سلسلہ میں قرض کی ضرورت ہو تو ان کے لیے آسانی سے بلا سودی قرض کا انتظام کرے۔

۲۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حکومت ان کو محض ناگہانی ضرورتوں ہی میں نہیں بلکہ معاشی اور معاشرتی ہر طرح کی ضرورتوں میں مدد دے گی۔ جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے شادی بیاہ، مقروض کے قرض کی ادائیگی اور کھیتی باڑی کے سامان کے لیے قرض نہیں بلکہ بیت المال سے مدد دی تھی۔[1]

۳۔ یہ معاشی معاملات اور معاشرتی ضرورتوں میں اسلامی حکومت مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہیں کرے گی۔ بلکہ جس طرح ایک مسلمان بطور حق بیت المال سے مدد لے سکتا ہے اسی طرح ایک غیر مسلم بھی اسلامی حکومت سے بطور حق اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ جس طرح وہ ایک مسلمان کی ضرورتیں پوری کرتی ہے اسی طرح ایک غیر مسلم کی بھی کرے۔

[1] یہ بات اسلامی حکومت کے شعبہ معاشیات کے ذمہ دار اور امیر مملکت کی صواب دید پر ہوگی۔ وہ ایسی ضرورتوں میں ان کو غیر واپسی مدد یا قرض دے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق حکومت کی معاشی حالت کی اچھائی یا خرابی سے ہے۔

امداد و اعانت اور قرض دہی اسلامی نظام کا ایک امتیازی وصف ہے۔ اسلامی حکومت میں یہ تنہا حکومت ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اہل حاجت کی حاجت روائی کرے بلکہ یہ ذمہ داری معاشرہ کے افراد پر بھی ہے کہ ضرورت کے وقت آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اور اگر کسی کو قرض کی ضرورت ہو تو اسے قرض دیں۔ اوپر فقیر و مسکین کی تشریح کرتے ہوئے امداد و اعانت کی شکلیں اور اس کے طریقے کی تفصیل کی جا چکی ہے۔ مگر اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر چند آیات اور احادیث پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس کا یہ پہلو واضح ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انہی آیات و احادیث کی روشنی میں یہ ہدایات جاری کی تھیں اور ہر اسلامی حکومت کو ان کی روشنی میں ہدایات جاری کرنی چاہئے۔

جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ کسی کو بغیر سود لئے قرض نہیں دیتے تھے اور سود بھی دوگنا چوگنا ہوتا تھا۔ اسلام نے جب سود کو حرام کیا تو یہی نہیں کہ آئندہ کے لئے اس کو حرام کہا بلکہ ماضی میں جو قرض سود پر دیا جا چکا تھا اس کو بھی معاف کر دینے کا حکم دیا۔ اور صرف اس بات کی اجازت دی کہ اپنا راس المال وصول کر لیں۔

فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ [1]

تمہیں اصل رقم لینے کا حق ہے۔

مگر بعض قرض دار جن میں اصل رقم ادا کرنے کی بھی سکت نہیں تھی ان کے بارے میں یہ حکم ہوا کہ ان کو اتنی مہلت دو کہ قرض کی ادائیگی کے قابل ہو سکیں۔

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ [2]

---

[1] البقرہ: ۲۷۹۔

[2] البقرہ: ۲۸۰۔

اگر وہ تنگ دست ہیں تو فراخ دست ہونے تک تم ان کو مہلت دو۔ لیکن اگر ایسے لوگوں کا قرض بالکل معاف کر دو تو یہ اور بہتر بات ہے۔ خدا انہیں اس کا جو اجر دے گا اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔

وَاِنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرہ: ۲۸۰-)

اگر تم ان کو معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم اس کو سمجھ سکو۔

ان آیات کی تشریح میں بے شمار احادیث مروی ہیں چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک بار آپ نے فرمایا۔

فاذا اتبع احدکم علی ملی فیتبع [1]

اگر کوئی مقروض کسی مال دار کو اپنے قرض کا ضامن بنائے تو اس کو یہ ضمانت لے لینی چاہیے یعنی اگر کوئی شخص قرض نہ ادا کر سکے اور وہ کسی دوسرے مال دار آدمی کو اس کا ضامن بنا دے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس ضمانت کو قبول کرے۔ اس درخواست کو رد نہیں کرنا چاہیے اب قرض دار ضامن سے اپنا روپیہ وصول کرے[2]

ایک بار آپ نے فرمایا۔

من سرہ ان یظلہ اللہ یوم لاظل الا ظلہ فلییسر علی معسر او لیضع عنہ [3]

جو یہ پسند کرتا ہو کہ قیامت کے دن جب اس کے سر پر کوئی سایہ تک نہ ہوگا خدا تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے تو اس کو چاہیے کہ یا تو مقروض کو مہلت دے یا پھر

---

[1] مشکوٰۃ: ۲۵۱ طبع سعید کمپنی کراچی۔

[2] اس کی تفصیلات اسلامی قانون کے دو بابوں میں ملیں گی۔ ایک باب الحوالہ دوسرے باب الکفالہ۔

[3] تفسیر ابن کثیر: ج ۱: ص ۳۳۱: لاہور: ۱۹۷۲ء۔

اس کو بالکل معاف کر دے۔

ایک دن آپ نے ایک نیک تاجر کا تذکرہ کر کے فرمایا۔

كان تاجرا يداين الناس فاذا رأى معسرا قال لفتيانه تجاوزوا عنه لعل الله ان يتجاوز عنا فتجاوز الله عنه [1]

پچھلے زمانہ میں ایک تاجر تھا جو اپنا مال لوگوں کو ادھار دے دیا کرتا تھا۔ رقم کی ادائیگی کے وقت جب وہ دیکھتا تھا کہ کوئی شخص تنگ دست ہے تو اپنے کارندوں سے کہتا تھا کہ اس سے قیمت نہ لو، معاف کر دو۔ ممکن ہے خدا تعالیٰ اس کے بدلے ہمیں معاف کر دے تو خدا نے اسے معاف کر دیا۔

ایک بار آپ نے فرمایا۔

من اراد أن تستجاب دعوته وانكشف كربته فيفرج عن معسر [2]

جو چاہتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کی دعا قبول کی جائے اور اس کی مصیبت دور کی جائے تو اس کو تنگ دست کے لیے آسانی فراہم کرنی چاہیے۔

آپ نے معاشرہ کے ضرورت مندوں کو محض قرض دینے اور اس کے واپس لینے میں نرمی برتنے کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ عملاً ایسا کر کے دکھایا بھی۔

ایک بار آپ نے ایک یہودی سے قرض لیا اور وقت پر ادا نہ کر سکے۔ اس نے آپ کے ساتھ سختی برتی اور بدتمیزی کی حضرت عمرؓ موجود تھے، ان کو یہودی کی حرکت پر غصہ آیا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ میرے ساتھ ہمدردی یہ ہے کہ اس کا قرض ادا کر دو۔ مقصد یہ ہے کہ اگر معاشرہ کا کوئی فرد ایسا ہے جو اپنا حق معاف نہیں کرتا ہے تو قرض خواہ کے ساتھ سختی اور اس کا حق

---

[1] بخاری: ۱: ۲۷۹ طبع دہلی۔

[2] تفسیر ابن کثیر: ۱: ۳۳۲ طبع لاہور۔

مارنے کے بجائے اپنے بھائی کی طرف سے قرض ادا کرکے اس کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیے
ایک بار کسی شخص کو پھلوں کی تجارت میں گھاٹا آیا جس کی وجہ سے وہ بہت مقروض ہوگیا۔
آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے عام صحابہ سے فرمایا کہ اس کا قرض ادا کردیں۔ چنانچہ صحابہ
نے اس کی مدد کی مگر اس کے باوجود قرض خواہ کی رقم پوری نہ ہوسکی۔ آپ نے قرض خواہ سے
فرمایا کہ:

"جو رقم یہ دے رہا ہے اسے لے لو اور اب اس سے زیادہ کی امید نہ رکھو"[1]

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر قرض خواہ کسی طرح کی ہمدردی کرنے کے لیے تیار
نہ ہو اور قرض دار اس کی ادائیگی کی سکت نہ رکھتا ہو اور بیت المال میں اس کے لیے گنجائش نہ
ہو تو حکومت قرض خواہ کو آمادہ کرے گی کہ وہ اپنا قرض چھوڑ دے

معاشرہ میں جو لوگ کسی کو قرض دیتے بھی ہیں تو ان کے ذہن میں مادی نہ سہی بہت
سے غیر مادی فوائد بھی پیش نظر ہوتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی اپنا حق سمجھتے ہیں کہ مقروض ان کا نیازمند
بن کر رہے۔ اس ذہنیت کی اصلاح کے لئے بھی اسلامی قانون میں تدبیریں کی گئی ہیں اسلامی
قانون کی یہ اہم دفعہ ہے کہ کل قرض جر نفعا فھو ربا کسی کو کچھ دے کر احسان دھرنا
اس کو برباد کر دیتا ہے۔

قرض دار اگر قرض خواہ کے پاس ہدیہ بھیجے تو آپؐ نے اس کے لینے سے منع فرمایا
ہے۔ فقہاء نے اس کو ایک قسم کا سود قرار دیا ہے۔

قرآن و حدیث کی اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کو قرض دینے
اور قرض دے کر نرمی برتنے یا معاف کر دینے کو اپنی کامیابی تصور کرتے تھے اور اس مادی
نقصان کو فائدہ سمجھتے تھے۔

حضرت ابو قتادہ نے ایک شخص کو قرض دیا۔ اس سے کئی بار تقاضا کیا۔ مگر جب وہ
تقاضے کے لیے آتے تو وہ گھر میں چھپ جاتا۔ ایک بار آئے تو گھر سے ایک لڑکا نکلا۔ آپ

نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ہاں گھر میں کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ نے آواز دی۔ وہ نکلا تو آپ نے کہا کہ تم مجھ سے چھپے کیوں پھرتے ہو؟۔ اس نے کہا کہ میں ابھی قرض ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لئے سامنے نہیں آتا۔ یہ سن کر پھر آپ نے اس سے پوچھا کہ واقعی تم ادا کرنے کے قابل نہیں ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوا کہ میں نے ایسے شخص کو کیوں شرمندہ کیا اور رو پڑے۔ پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص اپنے قرض دار سے نرمی برتے یا اس کو معاف کر دے تو وہ قیامت کے دن رحمت حق کے سایہ میں ہوگا۔[1]

اس روایت کے ایک راوی حضرت ابوالیسر صحابی ہیں۔ عبادہ بن صامت کے پوتے ان کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرے والد ان کے پاس حصول علم کے لئے گئے تو دیکھا کہ ان پر کچھ غصہ کے آثار ہیں۔ سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ۔

"فلاں شخص کے ذمہ میرا قرض باقی تھا۔ جب اس کے گھر گیا اور دریافت کیا تو گھر والوں نے کہا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ اتفاق سے ایک لڑکا گھر سے باہر نکلا میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں ہیں بولا کہ آپ کی آواز سن کر چھپ گئے ہیں انہوں نے آواز دی۔ وہ باہر نکلا تو آپ نے چھپ جانے کی وجہ پوچھی تو کہا کہ میں ڈرتا تھا کہ اگر آپ سے میں بات چیت کرتا اور سچ بولتا کہ میں مفلس ہوں تو ممکن تھا کہ آپ خفا ہو جاتے۔ اور اگر آپ سے جھوٹ بولتا یا غلط وعدہ کرتا تو یہ خوف تھا کہ ایک صحابی رسول سے جھوٹ بولوں گا یا وعدہ خلافی کروں گا۔ اس لئے میں چھپ گیا۔ واقعی میں اس وقت قرض کی ادائیگی سے معذور ہوں۔ آپ نے پھر

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۱: ۳۳۱ طبع سہیل اکیڈمی لاہور۔

پوچھا کہ کیا تم نادار ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا آپ نے قرض کی دستاویز منگائی اور اس پر جو کچھ لکھا تھا اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور فرمایا کہ اگر تم سے ہو جائے تو ادا کر نادر رہنے میں معاف کرتا ہوں۔ اور پھر فرمایا کہ میری دونوں آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا اور میرے سینے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد محفوظ ہے کہ آپ نے فرمایا۔

من انظر معسرا او وضع عنه اظله الله فی ظله [1]

جو شخص تنگ دست مقروض کو مہلت دے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے گا۔''

غرض یہ کہ حاجتمندوں، مزدوروں اور غریبوں کو ان کی ضرورتوں اور حادثوں میں قرض دینا اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے پھر اس قرض کی واپسی میں اسلامی حکومت یا اسلامی معاشرہ کا کوئی فرد قرض دار سے وہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا جو سود خوار مہاجن، مغلئے اور سرکاری خزانے اور پبلک بینک کے ذمہ دار اختیار کرتے ہیں کہ اگر وہ کسی مجبوری سے چند برس قرض نہ دے سکے تو سودی رقم اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ اس کو اپنی جائداد اور مکان حتی کہ اثاث البیت تک بیچ کر اس کی ادائیگی پر مجبور ہونا پڑے گا۔

یہاں ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ قرض کے عادی اور قرض لے کر اس کو ہضم کر جانے کے خوگر ہو جائیں گے اور اس سے معاشرہ اور حکومت دونوں کا نقصان ہوگا۔ مگر یہ سوال صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اسلام نے اپنی کسی تعلیم میں محض ایک پہلو پر نظر نہیں رکھی ہے، بلکہ اس کے دونوں پہلوؤں میں توازن باقی رکھا ہے چنانچہ ایک طرف حکومت اور اہل ثروت کو اہل حاجت کو قرض دینے کی ترغیب دی اور اس کے وصول کرنے میں نرمی برتنے کا حکم دیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی قرض

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۱: ۳۳۲ طبع سہیل اکیڈمی لاہور

ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور نہ ادا کرے تو وہ ظالم قرار دیا جائے گا۔ مطل الغنی ظلم[1] پیسہ ہوتے ہوئے ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

آپ لوگوں کو قرض سے باز رکھنے کے لئے یہاں تک شدت فرماتے تھے کہ مقروضوں کے جنازے کی نماز تک نہیں پڑھتے تھے ___ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا[2]

آپ نے فرمایا کہ مقروض کا قرض جب تک باقی ہے اس وقت تک وہ جنت میں داخل نہیں ہوتا[3]

اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص قرض ادا کر سکتا ہو مگر ادا کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرے تو اس کو حسب ضرورت سزا دی جا سکتی ہے۔ اس کی تفصیل فقہ کی تمام کتابوں میں ملے گی۔

بے روزگاروں، بیکاروں اپاہجوں اور بچوں کے وظیفے موجودہ دور میں

ان بے روزگاروں، بے کاروں اور اپاہجوں کے لئے تو حکومت کچھ سہولتیں فراہم کرتی ہے جو کسی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمت میں کچھ دن گزار چکے ہوں۔ اور اس کے بعد کسی مجبوری کی وجہ

---

[1] مشکوٰۃ ۱: ۲۵۰ طبع سعید کمپنی کراچی۔

[2] اس سے آپ کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگ حتی الامکان قرض لینے سے بچیں۔ دوسرا یہ تھا کہ دوسرے لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو اور وہ مرنے سے پہلے اس کو اس بار سے سبکدوش کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ کے سامنے ایک جنازہ لایا گیا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ مقروض تو نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں یہ مقروض ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ حضرت ابو قتادہ بولے یا رسول اللہ اس کا قرض میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے نماز پڑھی۔ بخاری ۱: ۳۰۶ مطبوعہ دہلی۔

[3] مشکوٰۃ: ۲۵۲ طبع کراچی۔

سے کام نہ کر سکتے ہوں۔ گو وہ بھی ایک خاص مدت تک، چنانچہ اوپر امریکہ میں ایسے بے کاروں کے لئے ایک نئی تجویز سوچی گئی ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ مزدوروں کے سلسلہ میں سوشل انشورنس وغیرہ اسکیمیں بنائی گئی ہیں۔ ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ جو مزدور کسی کارخانہ میں ملازم ہیں اور وہ برابر اپنی تنخواہ کا ایک حصہ کٹاتے رہتے ہیں ان کے لئے حکومت یا مالک کچھ سہولتیں فراہم کرتے ہیں ابھی لکھنؤ میں حکومت نے ایسے ہی مزدوروں کے لئے ایک اسپتال کھولا ہے جس سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کی زندگی کا بیمہ ہو چکا ہے۔ مگر ایسے بے روزگاروں، اپاہجوں اور بے کاروں کے لئے کوئی امدادی فنڈ حکومت کے پاس نہیں ہوتا جن کو ابھی تک کوئی کام ملا ہی نہیں ہے یا وہ پیدائشی طور پر بے کار ہیں۔ یا ایسے لوگوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور غور و پرداخت کی کوئی اخلاقی و قانونی ذمہ داری کوئی حکومت اپنے سر نہیں لیتی ہے برخلاف اس کے اسلامی حکومت پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسے تمام بے کار لوگوں کی کفالت کرے۔ خواہ وہ اپنی عمر کا ایک حصہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمت میں گزار چکے ہوں یا ان کو اس کا موقع ہی نہ ملا ہو۔ مزدور جن کارخانوں میں کام کرتے ہیں ان کے ذمہ داروں کا اور نجی ملازموں کے آقاؤں کا یہ اخلاقی اور قانونی فرض ہوگا کہ وہ کارخانوں میں لگے ہوئے مزدوروں کے مستقبل اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے شکلیں سوچیں جو اپنے بچوں کے بارے میں وہ سوچتے ہیں۔ اگر کوئی ضرورت باقی رہ گئی ہو تو وہ حکومت پورا کرے گی۔ اسی طرح جو لوگ بے کار ہوں ان کو باکار بنانا حکومت کا فرض ہوگا۔ اور جب تک وہ باکار نہ بن جائیں اس وقت تک اُن کی کفالت حکومت پر ہوگی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس کی کتنی فکر رہتی تھی۔ انہوں نے ایک نوجوان کو بے کار دیکھا تو اس کو فوراً ایک آدمی کے حوالہ کر کے فرمایا کہ اس کو مزدوری پر رکھ لو۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار دیکھا کہ ایک بوڑھا اندھا بھیک مانگ رہا ہے۔ آپؓ نے اس کا بازو اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ اس نے کہا کہ میں یہودی ہوں۔ اور جزیہ ادا کرنے کے لئے اور اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔

حضرت عمرؓ اس کو اپنے ساتھ گھر لائے۔ اس کو کچھ دیا اور بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ اس جیسے لوگوں کی دیکھ بھال کرو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم ان کی جوانی کی کمائی کھائیں اور ان کے بوڑھے ہونے پر ان کی امداد چھوڑ دیں۔ قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء و مساکین کے لیے ہے۔ فقراء تو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب ہیں، ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔[1]

اسی طرح دمشق جاتے وقت آپ نے عیسائیوں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ جذام میں مبتلا ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ صدقہ سے ان کی امداد کی جائے اور ان کا روزینہ مقرر کیا جائے۔[2]

ان واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مزدوروں، بے کاروں اپاہجوں کے سلسلہ میں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اسلامی حکومت یکساں سلوک کرے گی۔ ان میں اختلاف مذہب کی بنا پر کوئی امتیازی اور ترجیحی سلوک روا نہیں رکھے گی۔ زکوٰۃ کے مصارف میں فقراء و مساکین اور غارمین کے لئے جو رقم مقرر کی گئی اس کی کچھ تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ اس کو ذہن میں رکھا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اسلام نے بے وسیلہ لوگوں کی ضرورت کا کتنا لحاظ رکھا ہے۔

اس کی طرف خلفائے راشدین نے پوری پوری توجہ کی تھی۔ خاص طور پر حضرت عمرؓ نے تو اس کا ایک نظام بنایا تھا۔ آپ نے ایسے تمام بے کار آدمیوں کے لئے ماہانہ غلہ کی ایک مقدار مقرر کر دی تھی تاکہ وہ آسانی سے کھا پی سکیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس قدر احتیاط رکھی کہ کھانا پکوا کر خود اندازہ کیا کہ ایک آدمی کتنا کھا سکتا ہے۔ اسی اعتبار سے تمام لوگوں کو دو جریب فی کس

---

[1] کتاب الخراج صـ۲۷ حضرت عمر کا یہ استدلال ہماری راہنمائی کے لیے کافی ہے۔

[2] فتوح البلدان صـ۱۲۹ تحت فتح دمشق۔

غلہ مقرر کر دیا۔[1]

آپ نے نومولود بچوں کے وظیفے مقرر کئے۔ ابتدا میں یہ اعلان تھا کہ جب بچے دودھ چھوڑ دیں تو ان کو وظیفے دئے جائیں، مگر جب آپ کو یہ علم ہوا کہ مائیں اپنے بچوں کا دودھ اس لئے چھڑانے لگی ہیں کہ ان کے بچے وظیفہ کے مستحق ہو جائیں۔ تو آپؓ نے پھر اعلان کیا کہ بچوں کے پیدا ہوتے ہی وظیفے مقرر کئے جائیں۔

آپ نے اپنی شہادت سے چند دن پہلے یہ اعلان فرمایا کہ اگر میں آئندہ زندہ رہا تو عراق کی بیوہ عورتوں کی حالت ایسی سدھار دوں گا کہ وہ آئندہ کسی کی محتاج نہ ہوں۔[2]

ظاہر ہے کہ حکومت جب خود بے وسیلہ لوگوں کی پشت پناہی کرے گی تو ملک کا کوئی مزدور اور نادار آدمی اپنے اور اپنے بچوں اور عورتوں کے مستقبل کے بارے میں کیوں فکر مند ہو گا۔ اور اس فکر مندی میں نفع اندوزی کی وہ ذہنیت کیوں پیدا ہو گی جو اس کو کشمکش، اختلاف اور اسٹرائک پر مجبور کرتی ہے۔

وظیفہ میں مساوات حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ وظائف کے سلسلہ میں عموماً مساوات رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ ان لوگوں کو جو اسلام میں سبقت لے گئے اور جو بعد میں ایمان لائے، برابر رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ان کی فضیلتوں سے واقف ہوں ان کو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔ مگر۔ ھذا معاش فالمساواۃ فیہ خیر من الاثرۃ۔

---

[1] کتاب الاموال ص۲۴۷۔

[2] کتاب الخراج ص۲۴۔

[3] کتاب الاموال

یہ معاش کا معاملہ ہے اس میں مساوات ترجیح سے بہتر ہے۔

مگر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ابتدا میں اس میں ترجیحی اور امتیازی حقوق کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ مگر آخر میں حضرت عمرؓ بھی تقسیم دولت میں حضرت صدیقؓ کے طریقۂ کار کے حامی ہو گئے تھے چنانچہ آپ نے وفات سے ایک سال پہلے فرمایا۔

"اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو تقسیم دولت میں سب کو برابر کر دوں گا[1]"

غرض یہ کہ اسلام نے اس بارے میں آزادی دی ہے کہ حکومت اگر چاہے اور اس کے وسائل اس کی اجازت دیتے ہوں تو وہ اس بارے میں لوگوں کے درمیان امتیاز برتے۔ اور اگر وسائل یا حالات اجازت نہ دیں تو ترجیح وامتیاز برتنے کا بھی اس کو اختیار ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صورتیں اختیار کی ہیں۔ مگر مالِ "فئ" سے جو وظائف دئے جاتے تھے ان میں ہمیشہ مساوات ہی برتی ہے۔ مگر یہ مساوات بھی ضرورت واحتیاج کے لحاظ سے خالی نہیں تھی۔ حضرت عوف بن مالک فرماتے ہیں کہ:۔

کان اذا اتاہ الفئ قسمہ فی یومہ فاعطی الاٰھل حظین و اعطی العزب حظا[2]

آپ کا معمول تھا کہ مال فی کو اسی دن تقسیم فرما دیتے تھے تو اہل وعیال والے کو دو حصہ اور تنہا آدمی کو ایک حصہ عنایت فرماتے تھے۔

یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی شخص کو محض اس کی خدمت کی بنا پر حکومت لامحالہ اس کو معاش میں بھی ترجیح دے۔ ممکن ہے کہ اس کی محنت زیادہ ہو مگر ضرورت کم ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی خدمت کم ہو مگر ضرورت زیادہ ہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مذکورہ

---

[1] کتاب الاموال۔

[2] سلیمان بن اشعث: سنن ابی داؤد ۲/۱: ۴۱۰ طبع کانپور۔

ارشاد کا مطلب یہی ہے کہ معاش کے معاملہ میں حکومت ضرورت و احتیاج کو زیادہ مقدم رکھے گی بہرحال اسلام معاشی مساوات سے زیادہ معاشی انصاف پر زور دیتا ہے اس تفصیل سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلامی قانون میں مزدوروں، بیکاروں اور بے وسیلہ لوگوں کے دیکھ بھال اور ان کی کفالت کے لیے کتنے وسیع احکام دئے گیے ہیں۔ اور اس کے لیے اسلامی حکومت پر اس نے کتنی زبردست ذمہ داری ڈالی ہے اور حکومت کے کارکنوں میں کس طرح اخلاقی اور مساویانہ ذہنیت پیدا کی ہے۔

کیا اس قانون کے نفاذ کے بعد بھی مزدوروں اور محنت کش طبقہ کو اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت پیش آئے گی؟ اور اس کو مستقبل کی فکر کارخانہ داروں اور متاجروں سے کشمکش پر آمادہ کرے گی؟

چونکہ اسلام نے اجیر و متاجر کی کش مکش اور مزدور و سرمایہ دار کے اختلاف کے تمام اسباب ہی کو ختم کر دیا ہے اس لیے اس نے اسٹرائک اور مظاہرہ کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ اگر ایک فریق کو دوسرے فریق سے شکایت ہو گی تو اس کے انسداد کی تدبیریں خود حکومت سوچے گی اور اس کے لیے منصوبے بنائے گی۔

باب دوم

اِسلامی قانونِ اُجرت

اس وقت دنیا جن مسائل سے دوچار ہے، ان میں ایک بڑا مسئلہ مزدوروں کی بے چینی بے روزگاری اور ان کی متوازن اجرت بھی ہے، یعنی یہ کہ مزدوروں اور دوسرے محنت کش طبقہ کی اجرت اور مزدوری کا کون سا منصفانہ نظام قائم کیا جائے جس سے یہ طبقہ معاشی حیثیت سے بھی مطمئن ہوسکے اور معاشرتی اور سماجی حیثیت سے بھی اس کو معاشرہ میں وہی مقام حاصل ہو جو وہاں کے اونچے طبقہ کو حاصل ہے، اور اس کے لیے سیاسی اور تعلیمی ترقی کے مواقع اسی طرح موجود ہوں، جو وہاں کے خوشحال، دولت مند، تعلیم یافتہ افراد اور خاندان کے لیے ہوتے ہیں، اس طبقہ کے افراد زندگی کے کسی میدان میں اس لیے پیچھے نہ رہ جائیں، اور ان کی صلاحیتیں اس وجہ سے بروئے کار نہ آسکیں کہ ان کو اس کا موقع نہیں ملا۔

یوں تو محنت اور اجرت کا مسئلہ ہمیشہ سے اہم سمجھا جاتا رہا ہے، اور اس کی طرف کسی نہ کسی درجہ میں قانون اور اخلاق دونوں نے توجہ کی ہے، مگر صنعتی انقلاب کے بعد سے یہ قانونی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے دنیا کی موجودہ حکومتوں اور ملکوں کے لیے ایک درد سر بلکہ سب سے بڑا درد سر بنا ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مشینوں کے عام رواج سے پہلے جو کام ایک ہزار آدمی مل کر انجام دیتے اور اس کے ذریعہ اپنی روزی فراہم کرتے تھے، مشینوں کے عام رواج کے بعد وہ کام اب ایک مشین چند آدمیوں کے سہارے کر ڈالتی ہے، اس طرح جوں جوں مشین کا رواج بڑھتا ہے ملک میں بے روزگاری بڑھتی ہے، اور چونکہ ہر ملک میں کثرت تعداد مزدوری پیشہ اور محنت کش طبقہ کی ہی ہوتی ہے، اس لیے یہ مسئلہ چند افراد کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ بن جاتا ہے، مارچ ۵۶ء میں بین الاقوامی

ادارہ محنت (International Labour Organization.) کی طرف سے جو رپورٹ شائع ہوئی تھی، اس میں دنیا کی ڈھائی ارب آبادی میں مزدوروں کی تعداد ایک ارب بتائی گئی ہے۔

آج سے سو برس پہلے جب حکومت کا دائرہ اختیار ملک کے دفاع، امن و امان کے قیام اور ملکی باشندوں کے چند معاشی مسائل کی دیکھ بھال تک محدود تھا، اس وقت بھی اس مسئلہ کو کوئی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور اب جب کہ حکومت کا پنجۂ اقتدار اجتماعی زندگی کے مسائل سے بڑھ کر انفرادی اور شخصی مسائل کو بھی اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے، کوئی حکومت اس مسئلہ کی اہمیت سے کیسے صرف نظر کر سکتی ہے، بلکہ موجودہ دور میں تو کسی ملک کے ترقی یافتہ ہونے کا دارومدار وہاں کے مزدوروں اور محنت کش طبقہ کی خوشحالی اور بدحالی پر رہ گیا ہے جس ملک میں یہ طبقہ جس قدر مطمئن ہے اس کو اسی قدر ترقی یافتہ اور وہاں کی حکومت کو کامیاب سمجھا جاتا ہے، اور جہاں یہ طبقہ جس قدر پست اور زبوں حال ہے اس کو اسی اعتبار سے غیر ترقی یافتہ اور ناکامیاب کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں جتنے بھی نظامہائے زندگی رائج ہیں ان میں سے کسی نے بھی اب تک اجرت کا کوئی ایسا معقول اور معتدل نظام نہیں قائم کیا ہے، جس کی وجہ سے واقعی طور پر محنت کش طبقہ معاشی حیثیت سے بھی مطمئن ہو سکے، اور سماجی حیثیت سے بھی ہم وطنوں میں اس کی وہی پوزیشن بن سکے جو دوسرے طبقوں کی ہے اور اسی کے ساتھ وہ طبقہ وارانہ ذہنیت بھی مٹ سکے جو مزدور اور غیر مزدور کے درمیان پیدا ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے مستقل طور پر ہر ملک میں ایک کشمکش برپا ہے۔

جن ممالک میں "لادینی جمہوریت" (Secular Democracy.) کی کارفرمائی اور "بے قید معیشت" (Laissez Faire Economy) کا دور دورہ ہے، وہاں مزدور چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں پس رہا ہے، اور جہاں اس کی سرپرستی

حکومت نے قبول کر لی ہے یا دوسرے الفاظ میں جہاں "مزدوروں کا راج ہے" وہاں وہ "جبری محنت" اور "محدود اجرت" کا شکار ہے، بس فرق اتنا ہے کہ سرمایہ دار ملکوں میں اس کو مظاہرہ اور مطالبہ کرنے، دھمکی دینے اور ہڑتال کرنے کی اجازت یا موقع ہے، اور وہ اس طرح اپنی بے اطمینانی اور بے چینی کا اظہار کر لیتا ہے، اور جہاں محنت کے سارے ذرائع پر حکومت ہی قابض ہے۔ وہاں وہ اپنی بے چینی کا اظہار نہیں کر سکتا، اور اس طرح اس کی محنتوں اور صلاحیتوں کا خون ہوتا ہے۔

اس بے چینی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جنوری ۱۹۵۵ء سے اگست ۵۵ء کے درمیان امریکہ، برطانیہ، فرانس، جاپان اور ہندوستان میں متعدد بڑی بڑی ہڑتالیں ہوئیں، نومبر ۵۶ء میں برطانیہ کے گودی کے مزدوروں نے جو ہڑتال شروع کی تھی، اس کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ ابھی یہ ہڑتال ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ۲۰ ہزار گودی مزدوروں کے ساتھ ۷ ہزار ریلوے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی جس کی وجہ سے ملک کو کروڑوں روپئے کا نقصان اٹھانا پڑا اور رسل و رسائل کئی ماہ تک مفلوج رہے، امریکہ میں بھی برابر سٹرائکوں کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ دو تین سال پہلے یہاں چودہ سال یا اس سے زیادہ عمر کے بیکاروں کی تعداد ۲۸ لاکھ تھی[1] امریکہ کے محکمہ مردم شماری کی ایک رپورٹ کے مطابق ملک کی آبادی کے ساڑھے گیارہ $11\frac{1}{2}$ فی صد یا دو کروڑ ۵۴ لاکھ افراد خط افلاس سے بھی نچلی زندگی گذار رہے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق نیویارک شکاگو اور فلاڈلفیا میں رہنے والوں میں ہر ایک پانچواں شخص غریب ہے، واشنگٹن میں امیری اور غریبی کی بھیانک خلیج نظر آ رہی ہے اس شہر کی

---

[1] یہ اطلاع خود امریکی سفارت خانہ نے ہم تک پہنچائی ہے۔

آبادی کے ۱۸ فیصد افراد خط افلاس سے نچلی زندگی گذار رہے ہیں۔

امریکہ کی ایک اور تنظیم "انوائرمنٹل فنڈ" (Envirementa‌l Fund.) نے یہ قیاس لگایا ہے کہ آئندہ ۵ سالوں میں عالمگیر سطح پر بیروزگاری کا مسئلہ مزید سنگین رخ اختیار کرے گا، فنڈ کی پیش قیاسی ہے کہ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۵ء کے درمیان دنیا میں مزدوروں کی تعداد ۹۳ کروڑ ۱۳ لاکھ ہو جائے گی، فنڈ کے ایک سنیر افسر ڈاکٹر گریٹ یارڈ کا کہنا ہے کہ یہ اضافہ بھی انہیں علاقوں میں زیادہ ہوگا جو پہلے ہی سے زبردست بے روزگاری سے متاثر ہیں۔

لاطینی امریکہ کی مزدور طاقت میں ۱۹۹۵ء تک ۲۷ فیصد اضافہ ہو جائے گا یعنی مزدوروں کی کل تعداد ۱۹ کروڑ ۹۰ لاکھ ہو جائے گی، افریقہ کی مزدور طاقت میں ۲۰۱ فیصد کا اضافہ ہو گا۔ مزدوروں کی کل تعداد ۲۴ کروڑ ۸۱ لاکھ ہو گی، ایشیا میں یہ اضافہ ۴۷ فیصد ہو گا۔ مزدوروں کی تعداد ۳۶۹، ۱ ارب ہو گی، اسی طرح یورپ، امریکہ، روس میں مزدور طاقت کا اضافہ ہو گا۔

۱۵ سال میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان خلیج میں اضافہ ہو جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے دیہی علاقوں میں مزدور طاقتوں کی افزائش بہت تیزی سے ہو رہی ہے۔ لیکن افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ شہروں میں پہنچ کر اس دیہی آبادی کو کام نہیں مل رہا ہے، ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ان میں ترقی پذیر ملکوں کی آبادی میں اضافہ کا تناسب بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں آبادی میں بہت کم اضافہ بلکہ ایک طرح سے وہ رک سی گئی ہے۔ (سیاست جدید یکم ستمبر ۱۹۸۰ء)

اسی طرح دوسرے مزدوروں کی بے اطمینانی کی خبریں آتی رہتی ہیں، ہندوستان میں تو شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گذرتا ہو گا جس میں کوئی نہ کوئی ہڑتال یا مظاہرہ نہ ہوتا ہو، اپریل ۱۹۵۵ء میں کانپور کی تمام کپڑا مل کے مزدوروں نے ریشنلائزیشن (Rationalization.) کے خلاف کئی ماہ تک ہڑتال کر رکھی تھی، جس کی وجہ سے ملک کی کپڑے کی صنعت کو کروڑوں روپئے کا نقصان اٹھانا پڑا، اسی طرح ۱۹۷۴ء میں ریلوے اسٹرائک سے ۵۰ کروڑ روپئے کا

ملک کا نقصان ہوا، اور لاکھوں ورکروں نے جو مالی و جانی نقصانات اٹھائے وہ اس کے علاوہ ہیں، ۱۹۷۷ء کے آخر میں سکنڈری اسکول، ٹیچروں جونیئر انجینئروں اور ڈاکٹروں کی بڑی بڑی ہڑتالیں ہوئی، مارچ ۷۸ء میں سودیشی مل مزدوروں کی کئی دنوں تک ہڑتال جاری رہی۔

(قومی آواز ۱۷ / مارچ ۷۸ء)

اس عظیم نقصان کے ہوتے ہوئے بھی حکومت ایک تماشائی کی حیثیت سے یہ تماشہ دیکھتی رہی، کانپور کی اسٹرائک پر اس وقت کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش مسٹر سمپورنانند سے جب اس میں مداخلت کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ حکومت اس معاملہ میں دخل دینے کا ارادہ نہیں رکھتی، یہ مل مالکوں اور مزدوروں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ اسے خود ہی طے کر لیں، اسی کے ساتھ یہ بیان بھی حکومت نے دیدیا کہ کانپور کے لیے ریشنلائزیشن[1] (Rationalization.) ضروری ہے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہندوستان کی جمہوری حکومت کو اس کی بالکل فکر نہیں ہے کہ اس جدید کاری کا مزدوروں کی معاشی زندگی پر کیا اثر پڑے گا، اور اس میں حکومت کی اخلاقی ذمہ داری کیا ہے۔ بلکہ پریشان حال مزدوروں کے جسم وجان کو چند بے مروت سرمایہ داروں کے ہاتھوں سونپ دینا ہی اپنا جمہوری کارنامہ سمجھتی ہے۔ ہندوستان کے دستور میں بیگار اور جبری محنت کے خلاف دفعہ ۲۳ (۱) موجود ہے۔ بیس نکاتی پروگرام میں بھی اس کے دفعیہ کا ذکر ہے۔ ۱۹۷۶ء میں عملاً اس کے خلاف مہم بھی چل چکی ہے۔ مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب بھی یہ مکروہ رسم یہاں صرف باقی نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ خود اس کی مرتکب ہے۔ چنانچہ ۲۳ / اکتوبر ۸۳ء کے پائینر (PIONEER) میں ایڈیٹر نے ایڈوٹوریل نوٹ

---

[1] یہاں مزدوروں کی (Rationalization.) ایک غیر معاشی اصطلاح ہے۔ البتہ یہاں اس کا مطلب مزدوروں کو قوانین کے تابع کرنا مراد ہے۔

(Bonded Labour.) کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے مہاجن اور سرمایہ دار ہی اس کے مرتکب نہیں۔ بلکہ حکومت کے جیل خانے اس کے سب سے بڑے مرکز بنے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی مثال ان تمام ممالک میں محنت کش طبقہ کی حیثیت اور محنت کی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے کافی ہے، جہاں لادینی طرز حکومت (سیکولر ڈیما کریسی) کا رواج ہے۔

روس، چین اور مشرقی یورپ کے وہ ممالک جہاں اس وقت مزدور راج ہے، اسٹیٹ کے سخت کنٹرول کی وجہ سے وہاں کے بارے میں، ہمیں بہت کم خبریں ملتی ہیں، مگر پھر بھی سنسر کی خوردبین سے بچ کر یا غیر ملکی سیاحوں کے ذریعہ جو خبریں ہمیں ملتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس "مزدور راج" میں بھی مزدوروں کا حال سرمایہ دار ملکوں خاص طور سے امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ سے اچھا نہیں ہے، محنت کش طبقہ کو مطمئن کرنے کے لیے حکومت اپنے کارکنوں کی صفائی کرتی رہتی ہے، مگر اس صفائی اور محنت کی عزت افزائی کے باوجود وہاں کا اہل محنت طبقہ جبری محنت اور محدود آمدنی کا شکار ہے۔

جن ممالک میں تحریر و تقریر کی آزادی ہے اور وہاں کی حکومتیں خود اپنی سالانہ رپورٹیں دنیا کے سامنے پیش کرتی رہتی ہیں، ان میں اس طبقہ کی بری یا بھلی حالت کے بارے میں معلومات مل جاتی ہیں اسکے بارے میں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہاں زبان و قلم ہی نہیں بلکہ افکار و خیالات پر بھی سخت پہرہ لگا ہوا ہے وہاں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے، بہرحال اس سلسلہ میں جو معلومات ہمیں مل سکی ہیں، وہ یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

روس کی سرکاری ایجنسی تاس کا پندرہ روزہ ترجمان "سوویٹ دیس" نے نومبر کے ایک شمارے میں ایک مضمون "کیا سوویٹ روس میں برابری ہے؟" میں مزدور راج کا حال لکھا ہے،

> "انہیں اپنی مادی ضرورتیں پوری کرنے کے معاملہ میں اب بھی پوری برابری حاصل نہیں ہے کیونکہ انہیں سماج کی پیداوار سے اپنی ضرورت کے مطابق

نہیں بلکہ محنت کے مطابق حصہ ملتا ہے"۔ [1]

محنت کش طبقہ اور مزدوروں کے بارے میں یہ اعتراف ناکامی اس حکومت کو ہے جو ۳۸ برس [2] سے دنیا کو معاشی مساوات کا سبق دے رہی ہے۔

مزدوروں کو ضرورت کے مطابق سماج کی پیداوار سے کب برابر حصہ ملے گا، اس کی تعیین مشکل ہے۔ "مگر محنت کے اعتبار سے" ان کو کتنا اور کیسے حصہ ملتا ہے، اور ان کی محنت کی قدر و قیمت کا اندازہ کون لوگ لگاتے ہیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی، اس وقت اس فرق کو ملاحظہ فرمائیے جو حکومت کے عام کارکنوں اور مزدوروں کی اجرت کے درمیان پایا جاتا ہے، مشہور سوشلسٹ لیڈر مسز سوچیتا کرپلانی نے ۱۹۵۴ء کے وسط میں روس کا دورہ کیا تھا۔ ان کے دورہ کے جو تاثرات اخباروں میں شائع ہوئے تھے، اس کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"مزدوروں کی صحیح اجرت کیا تھی، یہ جاننا ہمارے لیے مشکل تھا، جب ہم نے کسی خاص صنعت میں وہاں کے مزدوروں کی زیادہ سے زیادہ اجرت اور کم سے کم اجرت دریافت کی تو انہوں نے ہمیں اوسط درجہ کے اعداد ہی مہیا کئے، پھر بھی کرید کر پوچھنے پر پتہ چلا کہ کم سے کم اجرت پانچ سو روبل تھی، اور کارخانہ کے ڈائرکٹر پانچ ہزار سے سات ہزار روبل تنخواہ پاتے تھے"۔

(دعوت ۲۵ / جولائی ۱۹۵۴ء)

ظاہر ہے کہ مسز سوچیتا کرپلانی کے کرید کر پوچھنے پر جو اجرتیں بتائی گئی ہوں گی، وہ ان کارخانوں کے مزدوروں کی ہوں گی، جن کو غیر ملکی سیاحوں کے سامنے بطور نمونہ پیش

---

[1] نومبر ۱۹۵۵ء سوویٹ دیس

[2] اب ۱۹۸۳ء میں اس کو پینسٹھ سال ہو چکے ہیں۔

کرنی ہونگی۔

ہندوستان کے محنت کشوں کو پانچ سو روبل[۱] کی اجرت بہت زیادہ معلوم ہوگی اور وہ یہ سوچیں گے کہ روس کے ایک معمولی مزدور کا معیار زندگی بھی اتنا ہی اونچا ہوگا، جتنا کہ یہاں ڈپٹی کلکٹر کا ہوتا ہے، مگر روس میں اشیاء کی گرانی اور وہاں کی تنخواہوں میں جو فرق ایک اور پچاس کی نسبت میں پایا جاتا ہے، اس کو سامنے رکھا جائے تو پھر یہ اجرت بے حقیقت معلوم ہوتی ہے، چونکہ اجرت کی قدر و قیمت کا اندازہ اشیاء کی ارزانی اور گرانی ہی سے لگایا جاتا ہے، اس لیے ہم اس کی تھوڑی سی تفصیل کرتے ہیں:

اگست یا ستمبر ۱۹۵۴ء میں ہندوستان سے ایک خیر سگالی وفد روس گیا تھا، جس کے ایک ممتاز ممبر گیانی گورمکھ سنگھ مسافر ممبر پارلیمنٹ تھے، انہوں نے اپنے مشاہدے مشہور روزنامہ "ملاپ" میں شائع کئے تھے، جس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مینجر اور مزدوروں میں جو فرق ہمارے دیش میں ہے، یا دوسرے دیشوں میں ہے وہ روس کے اندر بھی ہے، کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یکسانیت نہ سہی لیکن اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روس میں کام کرنے والے آدمی کی تنخواہ کم از کم ۵۰۰ روبل ہے، یہ بات کیا کم قابل رشک ہے۔

مگر پانچ سو روبل کی یہ تنخواہ اس وقت حقیر معلوم ہونے لگتی ہے، جب ہم روس میں عام ضروریات زندگی کی قیمتوں کو دیکھتے ہیں۔

یہ قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے دیش کے لوگ سنیں تو شاید ان میں کئی لوگوں کو غش آجائے، قیمتوں کا تھوڑا سا حال سنئے، یہ قیمتیں روبلوں میں ہیں اور ایک روبل ہمارے دیش کے ایک روپئے ایک آنہ چھ پائی کے برابر ہوتا ہے۔

---

[۱] یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے جب ہمارے یہاں ایک مزدور کو مشکل سے پچاس روپئے ماہوار ملتے تھے۔

ایک انڈا	۱½ روبل	ایک مرغا	۲۵ روبل
ٹماٹر	۲ روبل فی سیر	مولی	۵ روبل فی سیر
گاجر	۸ روبل فی سیر	شلجم	۷ روبل فی سیر
ڈبل روٹی	۲ روبل فی سیر	بکرے کا گوشت	۱۸ روبل فی سیر
دودھ	۶ روبل فی سیر	آلو	۴ روبل فی سیر
¼ دستہ کاغذ کی کاپی	۴ روبل	ایک ٹھنڈی قمیض	۲۰۰ روبل
گیہوں	۸۵ روبل فی من	عورتوں کا چھوٹا بٹوا	۹۰ روبل

یہ صرف چند چیزوں کی قیمتیں میں نے لکھی ہیں۔ ان سے اندازہ لگائیے کہ روس میں چیزوں کی قیمتوں کا کیا حال ہے، ہمارے ملک کے کسی آدمی کو اگر روس جا کر ایک قمیض کے لیے ۱۲۸ روپیہ ۱۲ آنے دینے پڑیں، ایک کاپی خریدنے کے لیے ۲ روپیہ ۶ آنے دینے پڑیں اور ایک انڈے کی قیمت ۲ روپئے ادا کرنی پڑے تو اس کا کیا حال ہوگا۔

اصلیت یہ ہے کہ ۵۰۰ روبل تنخواہ ہمیں ہندوستان میں بیٹھ کر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے، روس کے اندر ۵۰۰ روبل پانے والا صرف آلو اور ڈبل روٹی کھا کر گذر کر سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی[1]

اور جو حال روس میں ہے وہی حال دوسرے کمیونسٹ ملکوں کا ہے، دوسرے کمیونسٹ ممالک میں مزدوروں کی جو حالت ہے، اس کی طرف گیانی گورمکھ سنگھ نے محض اشارہ کیا ہے ان ملکوں میں اس طبقہ کی ناگفتہ بہ حالت کا بڑی حد تک اندازہ بین الاقوامی ادارہ محنت جس کا ایک ممبر روس بھی ہے۔ کے بیان سے ہوتا ہے، ۱۹۵۶ء میں اس ادارہ کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں

---

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۵۶ء کے ہیں۔ اس وقت یعنی ۱۹۸۴ء میں آپ اس اجرت کو ایک ہزار روبل میں تبدیل کر سکتے ہیں مگر اسی اعتبار سے گرانی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

مختلف ملکوں کے تاجروں نے جو بیانات دیئے ہیں، اسے ملاحظہ فرمائیے:

سوئٹزرلینڈ کے نمائندہ چارلس کسنسٹ سیشن نے ادارہ محنت کے اور مزدوروں کی انجمنوں کے بین الاقوامی کنفڈریشن (International Confederation of Labourer Union) کی اس طویل تحقیقات کی طرف اشارہ کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چیکوسلاویکیہ میں آزاد مزدور انجمنوں کا فقدان ہے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ ادارہ محنت نے مشترک طور پر جو تحقیقات کی تھیں ان سے ثابت ہو گیا کہ:

"چیکوسلاویکیہ کے مزدور قوانین بین الاقوامی ادارہ محنت کے اصول کے منافی ہیں"۔

اسی طرح فرانسیسی نمائندہ نے کہا:

"مزدوروں سے غلاموں کی طرح کام لینا انتہائی خوفناک قیمت وصول کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ روسی قوانین میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے، کہ سیاسی شبہات کی اساس پر مزدوروں سے تعلیم نو کے بہانے بیگار لی جا سکتی ہے"۔

فرانسیسی نمائندہ نے کہا کہ جب گذشتہ سال روس نے ادارہ محنت کے آئین کو باضابطہ طور پر منظور کر لیا تھا، تو وہ اب ان الزامات کا جواب کیوں نہیں دیتا، جو جبری مشقت اور مزدور تحریک کی آزادی کے فقدان کے بارے میں اس پر لگائے گئے ہیں۔

(نوائے وقت لاہور ۵ فروری ۵۸ء)

اس سلسلہ میں دو بیانات اور ملاحظہ ہوں، راشٹریہ مزدور سنگھ کے نائب صدر مسٹر رام سنگھ دریا نومبر ۵۵ء میں مزدوروں کے سمیلن میں شرکت کے لیے جنیوا گئے تھے، وہاں سے واپسی میں وہ روس بھی گئے واپس آکر مزدوروں کے ایک جلسہ عام میں انہوں نے جو بیان دیا وہ حسب ذیل ہے:

"میں نے روس کے دورہ میں یہ دیکھا کہ ہندوستانی مزدوروں کی حالت روسی

مزدوروں کے مقابلہ میں بہتر ہے، ہندوستان کے کمیونسٹ روسی مزدوروں کی خوشحالی کے جو افسانے سناتے ہیں، وہ ان کے طبع زاد ہیں، اگر روس میں مزدوروں کی تنخواہیں زیادہ ہیں، تو ضروریات زندگی کی قیمتیں بھی بڑھی ہوئی ہیں، اُجرتوں اور معاوضوں کے متعلق ہندوستان میں مزدوروں کو جو سہولتیں حاصل ہیں وہ روسی مزدوروں کو نصیب نہیں۔" (نوائے وقت ۲ر نومبر ۵۵ئہ)

اسی طرح نیشنل ٹریڈ یونین کانگریس کے صدر جی، ڈی اجیکر نے روس کے دورہ سے واپس آکر بمبئی کے ایک روزنامہ بوکا ساتا کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ:

روس میں مزدور تحریک کا کوئی وجود نہیں، انہوں نے کہا کہ وہاں مزدور انجمنیں اور تنظیمیں عملاً سرکاری محکمے ہیں۔" (نوائے وقت ۲۳ر دسمبر ۵۵ئہ)

یہ اس ملک کے مزدور لیڈروں کے بیانات ہیں، جس کے تعلقات روس سے انتہائی خوشگوار رہیں، ان پر امریکہ دوستی کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

اب کچھ حال چین کا بھی سن لیجیے جس کی تبدیلی اور ترقی کا چار دانگ عالم میں پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ اپریل ۵۳ئہ میں انڈین ورکرز ڈیلیگیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے برج کشور شاستری سرکاری دعوت پر چین گئے تھے، موصوف کو مزدوروں کے مسائل سے خاص دلچسپی ہے، اور ہندوستانی سوشلسٹ پارٹی کے ایک ممتاز رکن بھی ہیں، یہ تقریباً چھ ہفتے چین میں رہے، چینی مزدوروں کی حالت کے بارے میں ان کے تاثرات کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

چین میں چھوٹے بڑے بہت سے پروجکٹس (PROJECTS) زیر تکمیل ہیں، جن میں بانگسے زیو ریپروجکٹ خاص اہمیت رکھتا ہے، یہ پروجکٹ ایسے مقام پر مکمل کیا جارہا ہے، جہاں ہر وقت طوفان رہتا ہے اس پروجکٹ میں جو مزدور کام کر رہے تھے، ان کے بارے میں شاستری جی لکھتے ہیں۔

"اس پروجکٹ کے قریب افسروں کے رہنے کے لیے بنگلے بنے ہوئے ہیں تقریباً پانچ ہزار مزدور کام کر رہے ہیں، ہر قسم کا کام پتھر توڑنے سے لے کر سرنگ کھودنے یا چٹانی پتھروں کے ہٹانے تک کا کام برہنہ ہاتھوں سے ہو رہا ہے۔ مزدور جو اوزار استعمال کر رہے ہیں وہ بہت کمزور اور گھٹیا درجہ کے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی عجائب گھر سے اٹھا کر لائے گئے ہیں۔ ایک لمحہ کے لیے مجھ پر حیرت طاری ہوگئی کہ چینی محنت کشوں کی محنت کو عجیب طریقہ پر کام میں لایا جا رہا ہے"

مزدوروں کی اکثریت دور دراز مقامات سے درآمد کی گئی ہے، موجودہ نوکری چھوڑ کر اب وہ کسی غیر جگہ نوکری کے لیے نہیں جا سکتے، چینی کمیونسٹ پارٹی اور صدر ماؤزے تنگ جبری محنت جیسا روس کا آزمودہ نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔

اس بیان کے بعد چینی مزدوروں کے بارے میں مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہیں البتہ اتنی بات ضرور قابل ذکر ہے کہ اس جبری محنت کے بعد ان کو جو اجرتیں ملتی ہیں، وہ ہندوستان یا پاکستان کے ان مزدوروں کی اجرتوں سے بہت کم ہے جو ان کو کسی سرکاری کام یا کارخانوں میں ملتی ہے۔

ایک چینی مزدور کو ایک ہزار سے پندرہ سو یوآن[1] یا پچاس یونٹ[2] اجرت ملتی ہے یہ مختصر اجرت لے کر وہ جب بازار میں جاتا ہے تو اس کو ہوش ربا گرانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شاستری جی اس کے بارے میں کہتے ہیں:

"روزانہ استعمال کی چیزوں کی قیمتیں تو ہندوستان کی بہ نسبت چین میں بڑھی ہوئی ہیں، چاول، کپڑا، تیل اور نمک کی قیمتیں تو ہندوستان سے پچاس فی صدی بڑھی ہوئی ہیں، دوسری چیزوں کی گرانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔" (دعوت ۹ / فروری ۱۹۵۵ء)

وہاں کے مزدوروں اور بے روزگاروں کی بے چینی کا اندازہ اس خبر سے کیجیے جو ہندوستان کے تمام اخبارات میں حال ہی میں چھپی ہے۔

"پیکنگ ۱۵ / اکتوبر ۱۹۸۰ء چین کے مختلف صوبوں کے دو سو درخواست دہندگان نے کل پرانے سرکاری محل پر دھرنا دیا وہ قائم مقام وزیر اعظم ڈنگ شیونگ سے امداد کا مطالبہ کر رہے تھے اور پولیس کی بربریت کی شکایت کر رہے تھے۔ مظاہرین پنگ تان ہائی سے آئے تھے وہ کہہ رہے تھے" ہم بھوکے ہیں، بے روزگار ہیں، بے گھر ہیں اور ۷۶-۱۹۶۶ء کے ثقافتی انقلاب سے پہلے سے زیادتیوں اور سخت گیریوں کے شکار ہیں۔ پیکنگ میں چھ ہزار مظاہرین گرمی میں کیمپ ڈالے پڑے ہیں، اور ہفتوں سے دو سو مظاہرین باری باری دھرنا دے رہے ہیں ان میں سے اکثر بھیک مانگتے ہیں

---

[1] ایک یوآن ہندوستانی پیسے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

[2] ایک یونٹ آٹھ آنے یا اس سے کچھ زیادہ کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی پچاس یونٹ ہندوستان کے ۲۵-۲۶ روپے کے برابر ہیں۔

اور سڑک پر اپنا بستر جمائے ہوئے ہیں۔"

(عزائم لکھنؤ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء)

۶ر جنوری ۱۹۸۱ء کو ہندوستان کے سارے اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ روس کی طرح چین میں بھی جبری محنت کا نظام رائج ہے۔ ان سے بارہ گھنٹے سخت مشقت لی جاتی ہے اور ان کو بالکل معمولی خوراک دی جاتی ہے۔

ان بیانات اور مشاہدات پر ایک نظر ڈالئے اور پھر غور کیجئے کہ کیا برطانیہ، فرانس اور آپ کے ملک میں کم از کم سرکاری مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والے قلیوں کی اجرت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ اور کیا کمیونسٹ ملکوں کے مقابلہ میں یہاں اشیاء کی قیمتیں کم نہیں ہیں، پھر بھی ان ملکوں میں وہ اجرت کے بڑھانے کے مطالبے کرتے ہیں، حکومت اور مل مالکوں سے ان کی کشمکش بھی جاری رہتی ہے، ضرورت ہوتی ہے تو ہڑتال اور اسٹرائکیں بھی ہوتی ہیں، اور بسا اوقات مزدور تشدد پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تو کیا ان سے کم اجرت پانے والے اور ان سے گری ہوئی زندگی گذارنے والے مزدوروں کے جذبات میں اشتعال نہ پیدا ہوتا ہوگا۔ اور دوسرے ملکوں کے مزدوروں کی حالت سن کر ان کو غصہ نہ آتا ہوگا، مگر ظاہر ہے کہ وہاں تمام ذرائع آمدنی پر حکومت کا قبضہ ہے، اور اسی کے ساتھ جبری محنت کا کالا قانون نافذ ہے۔ اس لیے ان کے لیے اظہار جذبات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں کم از کم اس کے لیے یہ موقع تو ہے کہ وہ ایک کارخانہ چھوڑ کر دوسرے کارخانہ میں چلا جائے، کام بند کر دینے کی دھمکی دے، مزدوری بڑھانے کے لیے احتجاج کرے، مگر اس کالے قانون کا جہاں دور دورہ ہے۔ وہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف اقدام کرنے والا یا تو جیل میں ہوگا یا پھانسی کے تختہ پر۔

بعض کمیونسٹ دوست اس کا یہ جواب دیتے ہیں، کہ چونکہ کمیونسٹ ممالک

ہیں مزدوروں میں کوئی بے چینی ہے ہی نہیں اس لئے ان کو مظاہرے اور ہڑتال کی ضرورت نہیں پڑتی، مگر یہ بات وہی باور کر سکتا ہے جو انسان کی مادی خواہشات سے بالکل ناواقف ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہی نفع پرست اور پیٹ کا مارا مزدور سرمایہ دار ملکوں میں تو زیادہ سہولتیں پاکر غیر مطمئن اور پریشان ہو کر کش مکش پر آمادہ ہو جائے اور اسی ذہنیت بلکہ اس سے بھی زیادہ منفعت پرست ذہنیت کا مزدور کمیونسٹ ملکوں میں مطمئن اور خوش ہو۔ کمیونسٹ ملکوں میں سخت سنسر کے باوجود جو خبریں کبھی کبھی اخبارات میں آجاتی ہیں اس سے اس بے چینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی اگست ۱۹۸۰ء میں پولینڈ کے بارے میں ہندوستان کے اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی۔

وارسا۔ ۲۴ اگست۔ پولینڈ کی برسر اقتدار کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے آج پولٹ بیورو کے ۵ ممبروں اور وزیر اعظم ایڈورڈ کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا۔ ملک کی قیادت میں یہ زبردست تبدیلی ۱½ لاکھ صنعتی مزدوروں کی ہڑتال کا نتیجہ ہے۔

دوسرے برطرف لیڈروں میں نائب وزیر اعظم ٹی پیکا بھی شامل ہیں جنہیں گذشتہ ہفتہ حکومت کی جانب سے ہڑتالی مزدوروں سے گفتگو کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔

واضح رہے کہ پولینڈ کی ۴۰ فیکٹریوں میں آج گیارہویں دن بھی ہڑتال جاری ہے۔ پولٹ بیورو کے دوسرے ممبر مسٹر جوزف پنکو فسکی کو مسٹر ایڈورڈ کی جگہ پولینڈ کا نیا وزیر اعظم مقرر کیا گیا ہے۔

(عزائم ۲۴ اگست ۱۹۸۰ء)

یہ وہی پولینڈ ہے جس پر ۳۲ برس سے روس کا کنٹرول ہے اور جس کو مشرقی یورپ کی دوسری ریاستوں کی طرح کمیونزم کا سنہرا خواب دکھلا کر اس پر روس نے اپنی

سیاسی گرفت مضبوط کر لی تھی مگر اب یہ گرفت ڈھیلی ہی نہیں ٹوٹ رہی ہے، آج ۸۳ء میں مزدوروں کی انجمن سالیڈیریٹی کے صدر کو نوبل انعام حکومت مخالف تحریک میں جانبازی سے حصہ لینے کے لئے دیا گیا ہے۔

یہ بات اس ملک کے باشندوں کے لئے تو درست ہوسکتی ہے، جہاں کی ذہنیت میں اخلاق اور روحانیت کی کوئی گنجائش ہو، یا افادیت اور نفع پرستی کے علاوہ اس کے باشندوں کے اندر کوئی خالص انسانی جذبہ بھی کارفرما ہو۔ مگر جہاں خالص مادہ پرستانہ ذہنیت اور مفاد پرستانہ تصور پر اسٹیٹ کی بنیاد رکھی گئی ہو، اور وہاں کے باشندوں کو اسی کی تعلیم دی گئی ہو، وہاں کا کوئی فرد کم نفع پاکر سادہ اور معمولی زندگی پر گذر اوقات کر کے مستقل طور سے کیسے مطمئن ہوسکتا ہے۔ جب کہ اسی ملک کے ہزاروں آدمی عیش و تنعم کی مسرفانہ زندگی بسر کر رہے ہوں، کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ وہ چینی مزدور جو تیز طوفان میں ننگے ہاتھ خراب اور ناکارہ اوزاروں سے پتھر توڑنے کا کام کر رہے ہوں، وہ آرام دہ بنگلوں میں بیٹھ کر نگرانی کرنے والے افسروں کی عیش پرستانہ اور مسرفانہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنی معمولی سخت کوش زندگی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ یہ چیز اس وقت تو ممکن ہے کہ ان کی ذہنی تربیت اخلاقی اور غیر افادی قدروں کے تحت ہوئی ہو، یا پھر ان کے سامنے مساوات کا وہ اسوہ اور نمونہ ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں خندق کھود کر اور مسجد نبوی کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ کام کر کے پیش کیا تھا، یا پھر خلفائے راشدین نے جس کی مثال قائم کی تھی، اس مساوات، اسوۂ حسنہ اور اخلاقی ذہنیت کی موجودگی میں تو ایک مزدور وقت پڑنے پر پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی ملک کی تعمیر میں اپنی خوشی سے حصہ لے سکتا ہے اور نفع عاجل کے لیے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتا مگر خالص مادہ پرستانہ ذہنیت کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہے؟

مزدوروں کے تحفظات

محنت کش طبقہ کی بے چینی کو دور کرنے اور اس کو معاشی حیثیت سے مطمئن کرنے کے لئے ہر حکومت نے کچھ نہ کچھ تحفظات اور حقوق مقرر کئے ہیں، ہم اس وقت محض امریکہ اور روس کے مزدوروں کو دئے گئے حقوق اور ان کے معیار اُجرت پر بحث کریں گے اس لئے کہ اس وقت یہ دونوں محض دو ملک اور دو حکومتیں نہیں، بلکہ دو نظام زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور موجودہ دُنیا کسی نہ کسی درجہ میں معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے میں ان ہی کی تابع ہے۔

دنیا کی موجودہ سرمایہ دار حکومتوں نے حالات سے مجبور[1] ہو کر مزدوروں کو جو حقوق دیئے ہیں، عام طور پر یہ ہیں:

۱۔ ہر شعبۂ معیشت میں وہ اپنی تنظیم کر سکتے ہیں، یہ تنظیمیں ان کی طرف سے معاملہ چکانے کی مجاز ہوں گی۔

۲۔ قانونی طور پر ان عملی تدبیروں کے اختیار کرنے کا بھی ان کو کسی حد تک اختیار دیدیا گیا ہے۔ جن سے وہ اپنے مطالبات منوا سکیں مثلاً ہڑتال، مظاہرہ، مطالبہ وغیرہ۔

۳۔ اُجرتوں میں پہلے کے مقابلہ میں اضافہ۔

۴۔ اوقات کار میں کمی اور کام کرنے کے حالات میں نرمی۔

۵۔ عورتوں اور بچوں سے محنت لینے پر پابندی۔

۶۔ ان کی موت کے بعد ان کے بال بچوں کا خیال۔

۷۔ ان کے گھر اور ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش۔

---

[1] بے قید معیشت کی تاریخ کا یہ باب اپنے پیچھے ایک لمبی داستان رکھتا ہے۔

۸۔ سوشل انشورنس کی بعض اسکیموں کا نفاذ مثلاً بیمہ، شرکت منافع وغیرہ۔

۹۔ جسمانی نقصان کی تلافی۔

۱۰۔ حکومت جو مزدوروں کے معاملہ سے بالکل بے تعلق تھی اب اس نے اپنی حیثیت بھی تسلیم کر لی ہے کہ وہ آجر اور مستاجر کے درمیان ثالث بنے اور ان کے حقوق و فرائض کا تعین کرے۔

سرمایہ دار ملکوں میں مزدوروں کو جو حقوق دئے گئے ہیں، وہ بڑی حد تک وسیع اور ہمہ گیر ہیں، ان کی موجودگی میں ان ملکوں کے مزدوروں کو معاشی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے مطمئن ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے، آخر اس کے اسباب کیا ہیں۔

پہلا سبب سرمایہ دار ممالک میں بے روزگاری اور معاشی بحران کے آئے دن جو دورے پڑتے رہتے ہیں جس سے خاص طور سے مزدور اور محنت پیشہ طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب وہ سرمایہ پرستانہ اور افادیت پسندانہ ذہنیت ہے، جو اوپر سے لے کر نیچے تک ہر طبقہ میں ایک زبردست بلکہ واحد محرک کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ یہ ذہنیت جس ملک کے باشندوں میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ وہ ان کو پکے قسم کا خود غرض، دنیا پرست اور خواہشات کا بندہ بنا دے گی، ظاہر ہے کہ جس ملک کے باشندوں کی زندگی کا سب سے بڑا محرک اور معیار بلندی افادیت اور زیادہ سے زیادہ مادی منفعت ہو گیا اس کے ہر فرد کی یہ خواہش نہ ہو گی کہ یہ پورا خوان یغما جو اس سطح زمین پر بچھا ہوا ہے، اس کے قبضہ میں آجائے اور وہ جی کھول کر اپنے نفس کی خواہشوں اور امنگوں کو پورا کرتا ہے جبکہ کچھ لوگوں کو اپنی خواہش نفس پورا کرنے کے سارے مواقع موجود ہوں۔ پھر ان خواہشوں کے پورا کرنے کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے، مختلف افراد کی مختلف اور لامحدود خواہشیں

ہوتی ہیں۔ چونکہ سب کی خواہش یکساں طور پر پوری نہیں ہو سکتی اس لئے اس میں کشمکش ہوتی ہے، بڑا اپنے چھوٹے کے حقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے، اکثریت اقلیت کو پیستی ہے، سرمایہ دار مزدور کا خون چوس کر اپنی پر عیش زندگی کو رنگین بناتا ہے، اور مزدور کو موقع ملتا ہے تو سرمایہ دار کو نقصان پہنچا کر اپنی روٹی کا انتظام کرتا ہے غرض ایک شدید کشمکش ہوتی ہے، اسی ذہنیت کی وجہ سے سرمایہ دار ملکوں میں مظاہرے ہوتے ہیں، اسٹرائکیں اور ہڑتالیں ہوتی ہیں اس اسٹرائک میں نہ تو سرمایہ دار کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کتنے گھروں میں فاقہ ہو رہا ہے، اور نہ مزدور کو یہ فکر ہوتی ہے کہ اس سے ملک کی صنعت و معیشت کو کتنا نقصان ہو رہا ہے، دونوں اپنے اپنے فائدے کی فکر میں ہوتے ہیں، اس وقت سرمایہ دار ملکوں میں جو تھوڑی بہت بہتری پیدا ہو رہی ہے، اور وہاں مزدور اور محنت کش طبقہ کو جو تھوڑی بہت سہولتیں دی جا رہی ہیں، ان سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ معاشی وسائل کی ترقی خود بخود دولت کی موجودہ نامنصفانہ تقسیم اور معاشی ظلم کو ختم کر دے گی، مگر ان کا یہ سمجھنا ایک دھوکا اور ایک خوش نما فریب ہے۔

ان ممالک کے مزدوروں کو جو سہولتیں دی گئی ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہ ان کی ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے بلکہ حالات کے دباؤ، مصلحت پرستی اور اپنی مقصد برآری کے لئے ایسا کیا گیا ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب بھی مالک کو موقع ملتا ہے، وہ محنت پیشہ طبقہ کو بیکار کر دیتا ہے، چنانچہ امریکہ جیسے ملک میں جس کے ہر فرد کی اوسط آمدنی ۲۱ روپیہ روزانہ ہے لاکھوں آدمی بے کار ہیں، ممکن ہے کہ وہاں کے لوگ فاقے نہ کر رہے ہوں، مگر بے کاری بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔

پھر اس ذہنیت کا اثر محض معاشی زندگی ہی پر نہیں بلکہ سماجی زندگی پر بھی پڑتا ہے، چونکہ ان ممالک میں دولت اور دنیاوی وجاہت ہی بڑائی اور بلندی کا معیار ہوتی ہے، اس لئے مزدور پیشہ طبقہ کو سماج میں وہ مقام نہیں مل پاتا جو دوسرے طبقہ کو حاصل ہے، غرض یہ کہ اس ذہنیت کے ساتھ کسی ملک میں مستقل طور سے نہ تو معاشی حیثیت سے معتدل اور پُرسکون حالات پیدا

ہو سکتے ہیں، اور نہ سماجی حیثیت سے مساوات اور برابری پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرا سبب اس ذہنیت کے ساتھ ان ممالک میں دوسری خرابی معاشی نظام کی بے قیدی اور انفرادی ملکیت کی آزادی ہے، انفرادی ملکیت کی آزادی اور بے قید معیشت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بے روک ٹوک یہ موقع حاصل ہو کہ وہ جس قدر ذرائع پیداوار اور وسائل معاش کو چاہے اپنے قبضہ میں لے آئے اور جس طرح چاہے نفع اندوزی کے لئے سعی و جہد کرے، وہ جو مال چاہے تیار کرے اور اس پر جتنا نفع چاہے سمیٹے۔ جب خالص مادہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والے انسان کو معاش کے معاملہ میں بالکل چھوٹ دی جاتی ہے تو پھر وہ نفع کی کسی مقدار پر کبھی قناعت نہیں کرتا بلکہ وہ ملک کے پورے معاشی وسائل اور خاص طور سے محنت کش طبقہ کو اپنے اغراض و مفادات کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ جب چاہتا ہے ملک میں مصنوعی گرانی یا ارزانی پیدا کر دیتا ہے، اور جب چاہتا ہے بے روزگاری کا سوال پیدا کر دیتا ہے، خاص طور سے محنت کش طبقہ کی خوش حالی و بدحالی کا تو وہ مالک کل ہوتا ہے، حکومت اس معاملہ میں مداخلت کرنا جمہوریت اور دستوری آزادی کے منافی سمجھتی ہے، اور اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہتی ہے تو اس کو مجبور ہو کر پیچھے ہٹ جانا پڑتا ہے، ایک تازہ مثال ہندوستان میں کانپور مل مزدوروں کی ہڑتال ہے، اس میں سرمایہ داروں کی کھلی ہوئی زیادتی تھی، مگر حکومت نے یہی نہیں کہ اس میں دخل نہیں دیا بلکہ وہ آجروں کی پشت پناہ بن گئی، حکومت کا یہ بیان کتنا مضحکہ خیز تھا کہ جب تک پُرامن حالات نہیں پیدا ہوتے، اس وقت تک حکومت کوئی مداخلت نہیں کر سکتی، سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حالات خود استوار ہو جائیں گے تو پھر آپ کی اس میں کیا ضرورت باقی رہ جائے گی، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ غیر ملکی مسئلہ ہے جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اور جب تک دونوں فریق اس سے درخواست نہیں کرتے وہ اس میں حکم نہیں بن سکتی، حالانکہ یہ تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاملہ میں خود دخل

دیتی، اور ملک کے معاشی حالات کے لئے جو چیز مفید ہوتی، اسے کر ڈالتی ایک سال کے بعد جب ساڑھے چار ہزار مزدور تخفیف میں آگئے، تو اس وقت بھی حکومت نے کوئی قدم نہیں اٹھایا غرض یہ کہ (لادینی جمہوریت) سکولر ڈماکریسی جہاں بھی ہوگی ملک کی معاش پر اس کے زیر سایہ سرمایہ داری کا اسی طرح غلبہ ہوگا۔

بے قید معیشت کا دوسرا بڑا نتیجہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جس کے پاس جتنے ذرائع معاش ہیں وہ اتنے ہی زیادہ وسائل و ذرائع پر قابض ہوتا چلا جاتا ہے اور جو جتنا زیادہ محروم ہوتا ہے وہ اتنا ہی محروم ہوتا چلا جاتا ہے

تیسرا سبب

اس سلسلہ میں تیسری چیز بھاری مشینوں کی ایجاد ہے یہ چیز عام طور پر محنت کش طبقہ کے لئے مفید نہیں ہوتی، صنعتی ملکوں کے لئے تو ممکن ہے کہ یہ بھاری صنعت اور مشینوں کا عام استعمال مفید ہو سکے، جیسا کہ یورپ کے عام ممالک میں ہے مگر ہندوستان پاکستان اور ایشیا کے زراعتی ملکوں کے لئے یہ چیز کسی طرح مفید نہیں ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مشینوں کے استعمال سے پیداوار میں اضافہ ہوگا، تو ارزانی ہوگی، جس سے غریب اور مزدور طبقہ کو فائدہ ہوگا، مگر یہ بات طلب و رسد کے اصول سے ناواقفیت کی بناء پر کی جاتی ہے، جب تک عوام کی قوت خرید نہ بڑھے اس وقت تک ارزانی بے سود ہوگی فرض کیجئے کہ گیہوں، چالیس، ۴۰ روپے من فروخت ہونے لگے۔ تو ان کے لئے اس میں کیا دلچسپی ہے جن کی آمدنی چند روپے روزانہ سے زیادہ نہ ہو، اور وہ بیوی بچے بھی رکھتے ہوں، چنانچہ ہنگری کے واقعات سے پہلے مسٹر نہرو سب سے زیادہ زور بھاری صنعتوں پر دیتے تھے لیکن اس کے بعد وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ہم کو ہنگری کے واقعات سے سبق لینا چاہئے، زرعی پیداوار میں اضافہ ضروری ہے، کارخانے اور کھیت اب دونوں کی حیثیت برابر ہے

مزدوروں کو دیئے گئے حقوق

یہ تو چند باتیں بے قید معیشت کی ان خامیوں کے بارے میں کہی گئی ہیں جن کا اثر ملک کے عام باشندوں پر اور بالواسطہ مزدوروں پر پڑتا ہے، اب چند باتیں ان حقوق سے متعلق عرض کرنی ہیں جو سرمایہ دار ملکوں میں مزدوروں کو دیئے گئے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ مزدوروں کو جو حقوق بھی دیئے گئے، وہ ان کی طاقت اور حالات کے دباؤ اور مصلحت و خود غرضی کی بنا پر دیئے گئے ہیں، اس میں نہ تو کسی ذہنی تبدیلی کا اثر ہے اور نہ معاشی پالیسی میں کوئی فرق آیا ہے ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کے ساتھ جو حقوق بھی دیئے جائیں گے، ان کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ اوپر جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، ملک کی معاشی کنجی چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جب تک ان کی مصلحت اجازت دے گی یا حالات کا دباؤ باقی رہے گا، ان کے دیئے ہوئے حقوق باقی رہیں گے، لیکن جب یہ ان کی مصلحت کے خلاف ہوگا تو وہ اس کو ہضم کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں گے، اگر کچھ نہیں کر سکتے تو وہ کارخانہ بند کر کے ہزاروں آدمیوں کو بے کار تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس لیئے اصل چیز حقوق نہیں ہیں، بلکہ حقوق دینے والے کی ذہنیت ہے وہی اس کو مفید یا مضر بناتی ہے، اب ان حقوق کی ایک ایک دفعہ پر الگ الگ غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہ مزدوروں کیلئے مفید ہیں یا نہیں۔

۱۔ جمہوری دستور میں مزدوروں کو پہلا حق یہ دیا گیا ہے، کہ وہ اپنی تنظیم کر سکتے اور ٹریڈ یونین Trade Union. بنا سکتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس سے مزدوروں کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کسی نہ کسی حد تک مطمئن ہو گئے ہیں، مگر چونکہ یہ حق ان کو آجروں سے ایک طویل کش مکش کے بعد ملے ہیں اس لئے آجروں اور مزدوروں دونوں میں وہ ذہنیت باقی ہے، اور ان میں سے کسی کو جب بھی موقع ملتا ہے، دوسرے کے حقوق کو پامال کرنے میں دریغ نہیں کرتا، پھر مزدوروں کے حقوق کی

محافظ تنظیمیں محض محافظ تنظیمیں نہیں رہ گئی ہیں، بلکہ طبقاتی کشمکش نے ان کو ایک سیاسی مسئلہ بھی بنا دیا ہے اور چونکہ مزدوروں میں خود اس سے نپٹنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے، اس لئے ہر سیاسی جماعت اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہے وہ اپنے کو مزدوروں کا ہمدرد ثابت کر کے مزدوروں کی کسی نہ کسی تنظیم یا ملک کی کسی نہ کسی ٹریڈ یونین پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتی ہے اور کبھی کبھی وہ مزدوروں کو ایسے موقع پر استعمال کرتی ہیں جن کا تعلق مزدوروں کے مفاد کے مقابلہ میں ان کی سیاسی مصلحت سے زیادہ ہوتا ہے، اور چونکہ خود ان سیاسی جماعتوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں، اس لئے ملک کے مزدور مختلف حصوں میں بٹ جاتے ہیں اور ان کی کوئی یکساں پالیسی نہیں بننے پاتی، چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ٹریڈ یونین ہڑتال کا فیصلہ کرتی ہے اور دوسری جو کسی دوسری سیاسی جماعت کے زیر اثر ہے اور وہ اس کو اپنے مقاصد کے اعتبار سے غلط سمجھتی ہے اور ہڑتال سے روکتی ہے، اس طرح یہ مزدور یونینیں مزدوروں کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتی ہیں، ..... ایسا آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ خود مزدور انجمنیں آپس میں الجھ جاتی ہیں، چنانچہ کلکتہ کے گودی کے مزدوروں کی دو یونینوں بالشویک یونین اور نیشنل ورکرز یونین میں ۸ اگست ۱۹۵۵ء کو لڑائی ہو گئی تھی، جس میں پولیس کو آنسو گیس استعمال کرنی پڑی اور دونوں یونینوں کے ۱۳۰ افراد گرفتار ہوئے۔

(قومی آواز ۱۰ اگست ۵۵ء)

مزدور انجمنیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک تو مستاجروں کی طرف سے انہیں کچھ نمائندگی دے دی جاتی ہے، اس سے مزدوروں کو کم ہی فائدہ ہوتا ہے، ایسی نمائندگی کے بارے میں مشہور ماہر معاشیات مسٹر ڈاکٹر ٹاسگ Dr. Taussig. کہتے ہیں

اصلاحی تجاویز کے منجملہ ایک تجویز اجیروں کی نمائندگی ہے، یہ معاشرتی خرابیوں کا کوئی قطعی و کامل حل و علاج نہیں ہے۔

دوسرے مزدور خود اپنی تنظیم کرتے ہیں

مزدوروں کی جو آزاد ٹریڈ یونینیں قائم ہوتی ہیں، وہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ مفید ضرور ہوتی ہیں، مگر اس سے اجیر و مستاجر کے تعلقات میں ہم آہنگی پیدا ہونے کے بجائے مزید کش مکش بڑھتی ہے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کش مکش سے سیاسی جماعتیں فائدہ اٹھاتی ہیں اور مزدور مجموعی حیثیت سے گھاٹے میں رہتا ہے، پھر یہ ٹریڈ یونینیں جن لوگوں کو اپنا ذمہ دار بناتی ہیں، وہ بھی خالص مفاد پرست ہوتے ہیں، اس لئے اس فائدہ میں وہ بھی حصہ دار بن جاتے ہیں، جو انہوں نے مستاجروں سے حاصل کئے ہیں، ڈاکٹر ٹاسگ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"قیادت کا مسئلہ نہایت دقت طلب ہے، مزدوروں کی تحریک کے تمام مسائل پر اس کا اثر پڑتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معاشی و معاشرتی تنظیم کے سب مسائل سے اس کا گہرا تعلق ہے قیادت کا انحصار اساسی طور پر خود مزدوروں کے اخلاقی اوصاف اور ذہانت پر ہوتا ہے۔ جاہل اور بے اصول آدمی خراب قائد کا انتخاب کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ مزدوروں کے نمائندے خود مطلوبہ قابلیت یا سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ اور بعض اوقات وہ خواہ مخواہ اقتدار کو کام میں، لانے کی جانب راغب ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں رہی ہے، کہ مزدوروں کے قائد رشوت لینے کی جانب مائل ہو جاتے ہیں"

پھر ان تنظیموں کے اخراجات کا اثر مزدوروں کی جیبوں پر پڑتا ہے، اور چونکہ ان کی جیب میں محدود پیسہ ہوتا ہے، اس لئے ان تنظیموں کے ذریعہ جو ان کو تھوڑا بہت مالی فائدہ ہوتا بھی ہے، وہ ان کے قائد کھا جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جب تک کسی ملک کے عام باشندوں اور خاص طور سے سرمایہ دار اور مزدور کے تعلقات میں غیر افادی اور اخلاقی ذہنیت نہیں پیدا ہوتی، ان کی تنظیمیں ان کے لئے مفید نہیں بن سکتیں، بلکہ مزید کش مکش کا سبب

بن جاتی ہیں، اگر بفرض محال اس کش مکش کا کوئی عملی مظاہرہ نہ بھی ہو تو ذہنی طور پر ان میں طبقاتی ذہنیت پرورش پاتی ہے، جو ملک کی سماجی زندگی کے لیے تباہ کن ہے۔

۲- مزدوروں کو دوسرا حق یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے قانونی اور عملی تدبیر اختیار کر سکتے ہیں۔

پہلے حق کے ساتھ مزدوروں کو اس حق کے مل جانے سے کافی فائدہ پہنچا، اور پہلے کے مقابلہ میں وہ اس طرح بے بس نہیں رہے کہ ان کی مرضی کے سراسر خلاف سرمایہ دار جتنی چاہے محنت لے، اور جو چاہے اُجرت دے۔

اس حق کا استعمال

مزدور انجمنوں کے قیام کے بعد عموماً اس حق کا سارا اختیار انہی انجمنوں کے کارکنوں کو ہوتا ہے، اور یہ انجمنیں براہ راست یا بالواسطہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے زیر اثر ہوتی ہیں، اس لیے وہ جماعتیں جس وقت چاہتی ہیں، ان کے حق کو استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اور چونکہ ان جماعتوں کے پیش نظر اپنے اغراض اور سیاسی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں، اس لیے عموماً اس حق کے استعمال میں متعدد نقصانات ہوتے ہیں، اگر بالکل آزاد ٹریڈ یونین ہوں اور خود مزدوروں میں کسی سیاسی جماعت کی نگرانی کے بغیر اپنے حقوق کے استعمال کی صلاحیتیں موجود ہوں، جیسا کہ تمام جمہوری ملکوں اور امریکہ میں ہے، تو بھی اس کے استعمال میں بہت سے نقصانات ہیں اس سے اجیر و مستاجر میں کشمکش پیدا ہوتی ہے، اور یہ کش مکش آہستہ آہستہ مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے، جو معاشرتی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مضر ہے، اگر ان کا حق نہ مانا گیا تو ان کے لیے دو صورتیں ہوتی ہیں، یا تو وہ کام کرتے رہیں، مگر ایسی حالت میں ان میں بددلی پیدا ہوگی اور وہ کام بگاڑنے کی کوشش کریں گے، یا پھر اپنا آخری حربہ استعمال کریں گے، یعنی ہڑتال، اور یہ دونوں صورتیں معاشی اور صنعتی حیثیت سے مضر ہوں گی، مثال کے طور پر کان پور کی کپڑا ملوں کی ہڑتال پر ایک نظر ڈالئے

ان ملوں میں روزانہ ستر لاکھ گز کپڑا تیار ہوتا تھا، یہ ہڑتال پورے ۸۰ دن جاری رہی، اس طرح تقریباً ۸ کروڑ گز کپڑے کا نقصان ہوا، اندازہ لگائیے اس سے ملک کی صنعت اور پھر عام باشندگان ملک اور مزدوروں کی معاشی حالت پر کتنا اثر پڑا ہوگا پاکستان کے بارے میں مدیر "نوائے وقت" کا ایک اداریہ ملاحظہ ہو۔

بندۂ مزدور

پاکستان کے صنعتی کارخانوں میں آئے دن ہڑتالوں کی جو خبریں آتی رہتی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مزدور زیادہ مطمئن نہیں ہے، اس کی وجہ کچھ تو ملک کے معاشی حالات ہیں، اور کچھ یہ بھی کہ بعض طالع آزما اور نام نہاد لیڈر جو مزدوروں سے ہمدردی کے پردے میں اپنی قیادت کی دکان چمکانا چاہتے ہیں، ان کا استعمال کرتے رہتے ہیں۔

ہڑتال مزدوروں کے لئے آخری حربہ ہونا چاہئیے، جو اسی وقت استعمال کیا جائے جب کہ مفاہمت و مصالحت کے تمام دروازے بند ہوں، اور ان کے جائز مطالبات قطعاً تسلیم نہ کیئے جائیں، ادھر کارخانہ داروں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ کریں، جن کے تحت مزدور ہڑتال کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

پاکستان میں ٹکسٹائل کی قیمتیں ویسے ہی بڑھی چڑھی ہیں، ادھر ملوں کے مالکوں نے بھی شفٹیں کم کر دی ہیں۔ اب اگر ہڑتال ہو تو اس کا اثر پیداوار پر پڑے گا۔ اور چونکہ پاکستان میں محض موٹا (کورس) کپڑا تیار ہوتا ہے، جسے غریب و متوسط طبقہ استعمال کرتا ہے۔ اس لیے بالآخر اس کا براہ راست اثر مزدور طبقہ ہی پر پڑے گا۔

ابھی پچھلے دنوں پاکستان میں سگریٹوں کی شدید قلت ہو گئی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ملک کی واحد سگریٹ ساز کمپنی میں ۱۰۵ دنوں تک ہڑتال رہی، اور سگریٹ تیار نہ ہو سکے، نتیجۃً صارفین کو بڑی تکلیف ہوئی۔

جو لیڈر مزدوروں کو ہڑتال پر اکساتے ہیں، وہ نہ مزدوروں کی کوئی خدمت کرتے

ہیں، نہ ملک کی اسی طرح جو مل مالکان مزدوروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے، اور محض اپنی تجوریاں بھرنے کی خاطر ان کے جائز حقوق تلف کرتے ہیں، وہ بھی اپنے ملک اور عوام کی کوئی خدمت نہیں کرتے۔ (نوائے وقت، ۱۰ر جولائی ۱۹۵۶ء)

ہڑتال چونکہ ایک منفی استحقاق ہے، اس لئے اس کا اثر عموماً برا ہی پڑتا ہے، ہڑتال اس وقت کامیاب سمجھی جاتی ہے، جب مزدور اجتماعی طور پر ہڑتال کریں، اور پھر سابقہ حالت باقی رہے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے، اور ان کو کام چھوڑنا پڑا، یا مجبوراً ان کو کام پر واپس آنا پڑا۔ تو یہ ہڑتال ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی[1] چنانچہ اس کی واضح مثال کان پور کی کپڑا ملوں کی ہڑتال ہے، کہ مزدور انجمنوں کے ذمہ داروں اور سربراہ کاروں نے مجبور ہو کر ایسی صورتیں ڈھونڈنی شروع کر دیں کہ کسی طرح مزدوروں کو دوبارہ کام پر جانے کے لیے کوئی بہانہ ہاتھ آجائے، یہی وجہ ہے کہ مزدوروں کا حال اس وقت پہلے سے بھی برا ہے، ان کی ساکھ ختم ہو چکی ہے، اور وہ اس وقت بالکل کارخانہ داروں کے ہاتھ میں ہیں کہ وہ ان کو جس طرح چاہتے ہیں نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس طرح مزدور کے ہاتھ میں ہڑتال مالک کو مجبور کرنے کا ایک بڑا آلہ ہے، اسی طرح مالک کے ہاتھ میں اخراج بھی بہت بڑا آلہ ہے، جس کے اوپر کچھ پابندی تو عائد کی جا سکتی ہے، مگر اس سے ان کو محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایسی صورت میں مزدوروں کی ہڑتال کا کامیاب ہو جانا بہت ہی مشکل ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، مسٹر ٹاسگ جو مزدوروں کے حامی بلکہ اشتراکیت نواز ہیں، کہتے ہیں کہ:

"اگر آجر اپنے اقتدار اور اخراج کی تحدید کئے جانے پر راضی ہو جائیں

---

[1] اصول معاشیات حصہ دوم صفحہ ۲۸۹ مسٹر ایف ڈبلو ٹاسگ میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔

تو بھی لڑائی جھگڑے باقی رہیں گے اور ہڑتالوں سے کام لیا جائے گا۔"

(ہڑتال اور اخراج۔ ج ۴ ص ۴۱۱)

معاشیات کے ایک اور عالم لکھتے ہیں :

مزدور موقع دیکھ کر اکثر ایسے وقت میں اسٹرائک کرتے ہیں کہ آجر کا بہت زیادہ نقصان ہو تاکہ دباؤ خوب پڑے اور آجر کو مزدوروں کے مطالبات پورا کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ ہو۔ لیکن واضح ہو کہ کاروباری دنیا میں اسٹرائک کی حالت بعینہ اس پتھر کی سی ہے، جو تالاب میں کہیں گر کر پانی کی کل سطح پر قطار در قطار لہریں پھیلا دے۔

یوں تو تمام پیشے کم و بیش ایک دوسرے سے متعلق ہیں، لیکن بعض کا بالخصوص دوسروں سے نہایت قریبی تعلق پایا جاتا ہے، مثلاً کوئلہ اور مٹی کا تیل نکالنے والے یا ریلوے اور جہازوں پر کام کرنے والے اگر ہڑتال کر دیں تو ناممکن ہے کہ کوئی کاروبار اور کوئی پیشہ کم و بیش اس سے متاثر نہ ہو، انکی اسٹرائک سے علاوہ آجر کے عوام کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے نقصان اور تکلیف پہنچتی ہے۔

(اصول معاشیات برنی ص ۱۶۶)

اس سلسلہ میں قانون کی بےچارگی ملاحظہ ہو، مسٹر ٹاسگ لکھتے ہیں ؛

ہڑتال کے حق کو استعمال کرنے کو کس حد تک روا رکھا جائے گا، قانون کس درجہ تک ہڑتالیوں کو اجازت دے گا، کہ ان لوگوں پر جو ان کی جگہوں کو پُر کرنے کے لئے مستعد ہیں، دباؤ ڈالیں، اور کس شکل میں قانون کی قوت استعمال کی جائے گی یہ سب انتہائی مشکل سوالات ہیں، قانون فی نفسہٖ یعنی نہ صرف دستوری قانون بلکہ عدالتی قانون بھی ہنوز تغیر اور تبدل کی حالت میں ہے۔ (ج ۲ ص ۴۰۶)

موجودہ قانون کی بے بسی کے علاوہ جس کا اظہار مسٹر ٹاسگ نے کیا ہے، بہت

سے اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور دوسرے نقصانات ہیں، جو اس حق کے استعمال سے مزدوروں کو پہنچتے ہیں۔

۳- ان کو تیسری سہولت اضافۂ اجرت کے ذریعہ دی گئی ہے، مگر ظاہر ہے کہ ملک میں جب تک ایک مصنوعی تمدن موجود ہے دولت کی غلط تقسیم اور اخلاقی ذہنیت کا فقدان ہے، اس وقت تک صرف یہ چیز مزدوروں کے لئے مستقل طور پر قابل اطمینان نہیں ہو سکتی- ان چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی معاشی حیثیت سے اضافۂ اجرت کوئی حل نہیں ہے، کیونکہ اس کا دارومدار اصل کی زیادتی اور دولت کی بہتات پر ہے، اور اصل کی زیادتی یا دولت میں اضافہ کی قوت محدود ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی حد تک جا کر رک جائے گی، یا پھر ملک کی معاشی حالت کے پیش نظر یا صنعتی توازن قائم رکھنے کے لئے اسے روکنا پڑے گا، مگر ظاہر ہے کہ مفاد پرست مزدوروں کی خواہشوں اور ان کی ضرورتوں پر تو آپ کوئی پابندی نہیں لگا سکتے، اس لئے اصل کی زیادتی ایک حد کے بعد ان کی مانگ کا ساتھ نہیں دے سکے گی، اور پھر ان کی بے اطمینانی اپنی جگہ پر قائم رہے گی، اس کی مزید تفصیل آگے آئیگی۔

دفعہ ۴-۵-۶ | یہ حقوق بھی یقیناً مزدوروں کے حق میں بہت زیادہ مفید ہیں مگر جب تک کسی ملک کی دولت کی تقسیم صحیح اصولوں پر نہ ہو جائے، اس وقت تک مزدور کے اوقات کار میں کمی یا عورتوں اور بچوں سے کام کم لینے کی سہولت بے کار ہے، جو لوگ ۱۲ گھنٹے مسلسل کام کر کے اپنی صحت خراب کرتے ہیں یا اپنی عورتوں اور بچوں سے کام لیتے ہیں، ان کو اس کا شوق نہیں ہے، بلکہ وہ عموماً یا اپنی معاشی مجبوریوں کی بنا پر ایسا کرتے ہیں یا پھر ان کو مستقبل کی فکر لاحق ہوتی ہے، یا پھر ان کی زر اندوزی کی شدید خواہش انہیں اس پر مجبور کرتی ہے، ظاہر ہے کہ جب تک ان محرکات کی پورے طور پر اصلاح نہ کر دی جائے، جن کی بنا پر ان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، یہ سہولتیں بھی ان کے لئے سکون بخش نہیں ہو سکتیں اور موجودہ کسی نظام میں اس کی اصلاح کا کوئی واضح پروگرام نہیں ہے۔ آگے ہم اسلامی نقطۂ

نظر کے ضمن اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے

۷۔ ساتویں سہولت جو جمہوریت نے دی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے گھر اور ماحول کو بہتر بنایا جائے، چنانچہ ہر ملک میں کم از کم سرکاری کارخانوں کے مزدوروں کے لئے عمدہ اور صاف ستھرے ماحول بنائے گئے ہیں، یہ سہولت مزدور طبقہ کو اس لئے دی گئی ہے تاکہ وہ تمدنی اور سماجی اعتبار سے ترقی یافتہ باشندگان ملک کی سطح تک پہنچ سکیں، اور ان کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔

جب تک کہ ملک کی پوری معاشی، سماجی اور تعلیمی حالت درست نہ ہو، اس وقت تک مزدوروں کی اس سہولت کی مثال ایسی ہی ہوگی، جیسے کہ کسی جنگلی جانور کو جنگل سے لاکر سدھے ہوئے جانوروں کے ساتھ باندھ دیا جائے، یا کسی مردہ آدمی کو عمدہ لباس پہنا کر کسی عمدہ مکان میں بحیثیت مالک کے بسا دیا جائے، اس وقت اتفاق سے دنیا کی معاشی اور سیاسی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، ان کا انداز فکر اور طریق کار دونوں نہایت سطحی ہیں، وہ زندگی کے کسی مسئلہ کو نہ تو بنیادی طور پر سوچتے ہیں، اور نہ اس میں انسانی فطرت اور پورے ملک کے سماج کا کوئی خیال کرتے ہیں، بلکہ اس وقت ان کا انداز فکر و عمل دونوں اس محور پر گھومتے ہیں کہ دنیا کے سامنے ہم کسی طرح اپنے کو ترقی یافتہ اور برتر دکھا سکیں،

چنانچہ مزدوروں کے مسئلہ میں بھی ایسا ہی ہے، انہوں نے نہ تو ملک کے باشندوں کی عام ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی، نہ تقسیم دولت کا منصفانہ نظام جاری کیا، نہ ملک کے پورے مزدور پیشہ طبقہ کو سامنے رکھ کر کوئی معتدل طریقہ کار سوچا، اس لئے ایسی اسکیم کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ ملک کے چند ہزار یا چند لاکھ مزدور اچھے اور صاف ستھرے مکانوں میں رہنے لگتے ہیں، اور بظاہر ان کا معیار زندگی کچھ بلند نظر آنے لگتا ہے، مگر اس اسکیم سے نہ تو عام محنت کش طبقہ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، اور نہ اس وجہ سے ان لوگوں کو سماج میں وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو وہاں کے اونچے طبقہ کا ہے، اور نہ واقعی طور پر ان

کا معیار زندگی ہی بلند ہو پاتا ہے، بلکہ ان مکانوں کو کچھ دنوں میں وہ اس معیار پر لے آتے ہیں جو ان کا عام معیار زندگی ہے، بات یہ ہے کہ جب تک ملک میں کوئی ایسی معتدل سماجی ذہنیت نہ پیدا کی جائے جس کی بنا پر جسمانی محنت اور مزدوری کوئی کمتر چیز نہ سمجھی جائے۔

اور ایسی معاشی اسکیم نافذ کی جائے جس میں پورے گرے ہوئے لوگوں کو یکساں طور پر اوپر اٹھنے کا موقع ملے، اس وقت تک کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی، کسی ایک طبقہ کی اکثریت کو نظر انداز کر کے اس کے چند افراد کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی جائے گی تو اس طبقہ کی اکثریت اپنے سماجی رسم و رواج کے سہارے ان کو یا تو اس معیار پر واپس لائے گی۔ جس میں وہ اس وقت ہیں، یا پھر خود اس طبقہ میں دو سماجی گروہ پیدا ہو جائیں گے ایک اونچا دوسرا نیچا اور اس سے طبقہ واریت میں مزید اضافہ ہوگا۔

بہر نوع جو صورت بھی اختیار کی جائے گی حقیقۃً اس کو کامیاب نہیں کہا جا سکتا، ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مزدوروں کو خود اس قابل بنایا جاتا کہ وہ اپنے لئے مکان اور صاف ستھرا ماحول تلاش کر لیتے، مصنوعی طور پر ان کو اس معیار پر نہیں لایا جا سکتا،

۸۔ جانی نقصان کی تلافی

یہ رعایت بھی اسی وقت مفید ہو سکتی ہے، جب خود حکومت بھی اس تلافی میں شریک ہو مگر جمہوری ملکوں میں اس کی شاید ایک مثال بھی نہیں ملے گی، کہ خود حکومت بھی اس کی پوری ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار ہو، وہ جو کچھ کرتی ہے، مزدوروں کے پیسہ ہی سے کرتی ہے اور چونکہ ان کا پیسہ محدود ہوتا ہے، اس لئے اس کا فائدہ بھی محدود ہوتا ہے۔

۹۔ سوشل انشورنس کی بعض سکیموں کا نفاذ

مثلاً شرکت منافع، قانون مفلسی، مزدوروں کا بیمہ وغیرہ، یہ اسکیمیں مزدوروں کے لئے اپنے اندر بڑی افادیت رکھتی ہیں، مگر اس سے بھی باشندگان ملک کی بہت محدود تعداد فائدہ اٹھا پاتی ہے، کیونکہ سرمایہ دار ملکوں کی ساری معیشت چند افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، اور حکومت اس معاملہ

میں کوئی مداخلت کرنا جمہوریت کے خلاف سمجھتی ہے، اس لئے لاکھوں آدمی جو ملک میں بے کار ہوتے ہیں ان کی ذمہ داری لینے والا کوئی نہیں ہوتا، سرمایہ دار اپنے نفع پر نظر رکھتا ہے، حکومت اس کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتی، سوسائٹی میں ہمدردی اور بہی خواہی کا فقدان ہوتا ہے، اس لئے اس کو کوئی فکر نہیں ہوتی کہ کون کس حال میں ہے۔

عام طور پر مزدوروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی جیب میں پیسہ نہ ہو تو وہ معقول علاج نہیں کرا سکتے اگر کوئی مزدور کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس کا یتیم بچہ تعلیم و تربیت کا مستحق اسی وقت قرار پائے گا جب اس کا باپ انشورنس پالیسی چھوڑ کر مرا ہو لیکن جو لوگ بالکل غریب اور بے وسیلہ ہیں، ان کا کوئی پرسان حال نہیں یہ الگ بات ہے کہ اتفاقی طور سے ان کو کوئی مدد مل جائے۔

شرکت منافع کا رواج اس وقت کافی بڑھ رہا ہے، شرکت منافع کی دو صورتیں اس وقت رائج ہیں، ایک یہ کہ مزدور اور معمولی ملازم اپنی آمدنی سے کچھ بچا کر جن کارخانوں یا صنعتی کمپنیوں میں وہ کام کر رہے ہیں، ان کے کچھ حصے خرید لیں، اور ان کے منافع میں شریک ہو جائیں۔

دوسری صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ کارخانہ داران کی اجرت کا کچھ حصہ ان کو نقد دے دیتا ہے۔ اور کچھ حصہ کارخانہ میں لگا کر حصہ دار بنا دیتا ہے، چنانچہ اس وقت بعض ملکوں کے مشہور کارخانوں میں ۸۰، ۹۰ فیصدی تک حصہ دار مزدور اور معمولی ملازم ہو گئے ہیں۔

لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ آسانیاں بھی چند ہزار یا چند لاکھ آدمیوں کو مل سکی ہیں مجموعی حیثیت سے یہ اسکیم ملک کے محنت کش طبقہ کے لئے مفید نہیں ہو سکی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز آجروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، مسٹر ٹاسگ اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ

> وہ شرکت منافع کی تجویز کے بارے میں ایک زمانہ میں بڑے شد و مد کے ساتھ یہ کہا گیا تھا، کہ وہ مسئلہ محنت کا حل ہے اور یہ توقع کی گئی تھی کہ اس کو عام طور سے اختیار کر لیا جائے گا، اور تمام صنعتی دنیا میں امن و امان قائم ہو جائے گا لیکن اس تحریک کی سست رفتاری اور اس کے طریقوں پر روز افزوں

تنقیدات نے ان توقعات پر پانی پھیر دیا۔ پھر بھی بعض ایسے سرگرم وکیل موجود ہیں، جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے امکانات ہیں،،

اس ناکامی کی وجہ تو اصل میں مفاد پرستانہ ذہنیت اور ہمدردی وجذبۂ اخوت کا فقدان ہے جس کے بغیر کوئی اسکیم صحیح صورت میں نافذ ہی نہیں ہوسکتی، مگر اس طرف عام معاشی ماہرین کی توجہ کم ہوتی ہے، مسٹر ٹاسگ گو خالص مادی ذہن کے آدمی ہیں، مگر پھر بھی ان میں حقیقت کی تلاش وجستجو کا مادہ موجود ہے، اس لیئے انہوں نے نہایت صفائی سے اس کا اعتراف کر لیا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

تا وقتیکہ اس تجویز سے آجر کو نفع نہ ہو، اس پر عام طور سے عمل نہ کیا جائے گا یہ صحیح ہے کہ بعض کشادہ دل آج ایسے طریقے اختیار کر لیں گے خواہ اس سے ان کو کوئی مالی منفعت نہ بھی ہوتی ہو، بعض بڑے بڑے کارخانوں کا انتظام اخوت کا قومی جذبہ رکھنے والے اور قابل افراد نے کیا ہے۔ اور اپنے گردوپیش منتظمین اور مزدوروں کا ایسا عملہ جمع کر لیا ہے۔ جو اس قسم کے جذبے سے مملو ہیں، بدقسمتی سے یہ جذبہ بہت کمیاب ہے، اگر یہ عام ہو جائے تو معاشی دنیا کا تمام رُخ بدل جائے۔

(ج ۲ ص ۲۷۴)

سرمایہ داروں کی اکثریت اس تجویز کو اس لیئے پسند نہیں کرتی کہ اس کے اندر مزدوروں کے ساتھ کوئی جذبہ رحم پیدا ہو گیا ہے، بلکہ کچھ حالات کے دباؤ سے اور کچھ اس لیئے کہ ان کا جذبہ مقابلہ اس طرح دب جائے گا، مگر حقیقت میں اس سے مزدوروں کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہوتا، اس طرح کی مثالیں روزانہ سامنے آتی رہتی ہیں، کہ ایک آدمی کسی کارخانہ یا کاروبار کا حصہ خریدتا ہے، اور ہزاروں روپیہ کا حصہ خریدنے کے بعد سال میں اس کو چند روپے سے زیادہ ہاتھ نہیں لگتے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاروبار میں نفع کم ہوتا ہے بلکہ

اس نفع کا ۳/۴ حصہ کارخانہ دار یا منتظم مختلف طریقوں سے اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔
غرض یہ کہ یہ اسکیم اپنی افادیت کے باوجود اس وقت تک مزدوروں کے لئے مفید نہیں ہو سکتی جب تک بے قید معیشت کا جال نہ توڑا جائے، اور آجروں میں اخلاقی ذہنیت نہ پیدا ہو جائے۔

۱۰۔ حکومت کی مداخلت

ابھی تک سرمایہ دار ملکوں میں سے کسی ایک ملک میں بھی حکومت پورے طور پر اپنے کو مزدوروں کے مسئلہ کا ذمہ دار نہیں سمجھتی، بلکہ اس کا دار و مدار بالکلیہ مستاجروں کے رحم و کرم پر ہے، اس کی مثال کانپور کی کپڑا مل اسٹرائک ہے کہ کئی مہینہ گذر جانے کے بعد بھی حکومت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی، بلکہ اپنے چھوٹے اقتدار کے لئے مزدوروں کی اسٹرائک کروانا اس نے جمہوریت کا کارنامہ سمجھا، اسی طرح ۱۹۶۰ء میں ریلوے اسٹرائک کے سلسلہ میں یہی رویہ اختیار کیا گیا، غرض یہ کہ مزدور پیشہ طبقہ کو جو حقوق بھی دیئے گئے ہیں، ان کی افادیت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ پورے ملک کی ذہنیت میں بنیادی تبدیلی نہ ہو اور بے قید معیشت کے نظام کو ختم کر کے ایک آزاد اور معتدل نظام معیشت نہ جاری کیا جائے،

کیمونزم

کمیونسٹ ممالک میں مزدوروں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں، ان کی پوری تفصیل کا تو موقع نہیں ہے، مگر حال ہی میں کمیونسٹ چین نے جو سرکاری صنعتوں اور کارخانوں کے مزدوروں کا "ضابطہ کار" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، اس کتاب میں جو حقوق و فرائض مقرر کئے گئے ہیں اس سے دوسرے کمیونسٹ ملکوں کے ضوابط و قوانین کو قیاس کیا جا سکتا ہے، ان قوانین کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے:

مزدوروں کو اجتماعی سودے بازی یا تنظیم کی آزادی کا کوئی حق حاصل نہیں

ہے، ان کا فرض محض اتنا ہے کہ وہ نظم وضبط کے اصول پر کاربند رہیں۔"

ظاہر ہے کہ اس نقطہ نظر کے تحت جو حقوق دیئے جائیں گے ان کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی، اس کتاب میں ۴۲ دفعات ہیں پہلے باب میں حسب ذیل ۶ دفعات ہیں۔

پہلی دفعہ ۱:۔ ایسے مزدوروں سے کام لینا غیر قانونی فعل ہوگا جن کے پاس سرکاری رپورٹ نہ ہو۔

سرکاری رپورٹ میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ اس نے کہاں ملازمت کی ہے، تعلیم کا کیا معیار ہے، پولیس میں اس کا کیا ریکارڈ ہے۔؟

دفعہ ۳ کے تحت یہ قانون ہے۔

"اجرت کے لئے کوئی سودے بازی نہیں کی جا سکتی، بلکہ ہر کام کی اجرت طے شدہ معیار کے مطابق مقرر کیجاتی ہے۔"

دفعہ ۴ میں کہا گیا ہے کہ۔

کوئی مزدور یا عملہ کارکن، منیجر، یا ادارے کے افسر اعلیٰ کی منظوری کے بغیر کام نہیں چھوڑ سکتا، نہ اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے، ایسا نہ کرنا تنظیم اور ضبط کے قواعد کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔"

دفعہ ۵ میں یہ جبری قانون ہے کہ۔

"کسی مزدور کو اس کی مرضی کے بغیر تبدیل یا سبکدوش نہیں کیا جا سکتا لیکن اس قاعدے کی خلاف ورزی کیجائے تو مزدور کو اس سے زیادہ حق نہیں کہ وہ اپنی ٹریڈ یونین سے شکایت کر دے۔"

باب دوم میں صرف دو دفعات ہیں جن میں کارخانے کے منتظمین کے فرائض اور ان کے اختیارات درج ہیں۔ مثلاً مزدوروں کو منظم کریں، ان کے سپرد وہی کام کریں جس کے لیے وہ موزوں ہوں، نظم و ضبط کے قواعد کو سختی سے نافذ کریں، اور یہ

مزدوروں کے حقوق بیان کیے گیے ہیں، اب ان کے فرائض ملاحظہ کیجئے۔

دفعہ ۸ میں ہے کہ:

مزدور اپنے کارخانے یا ادارے کے تمام راز محفوظ رکھیں، سرکاری مال کی حفاظت کریں، ہر روز مقررہ وقت تک اپنا اپنا کام مکمل کریں، اوقاتِ کار کے متعلق متعدد قوانین ہیں مثلاً۔

اوقات مقرر کرنے کا اختیار صرف فیکٹری کے منتظمین کو حاصل ہے ہر مزدور کے آنے اور جانے کے وقت تلاشی لی جائے گی۔

تشدد اور سزائیں

دفعہ ۱۳ کے تحت بات چیت کرنے یا دوسری معاشرتی سرگرمیوں کے لئے کام بند کرنے یا کام کے وقت سماجی امور کے لئے کوئی جلسہ کرنے کی ممانعت ہے، اس کی خلاف ورزی کرنے والے پر عدالت میں مقدمہ چلے گا۔

اس "مزدور راج" کے ان قوانین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جائے گا، کہ محنت کو معاشیات کا اصل عامل قرار دینے والا انظام زندگی دنیا کے کسی حصہ پر قائم ہوتا ہے۔ تو وہ اہل محنت کی عزت افزائی کرتا ہے، یا اس کو جبر و قہر کے سخت شکنجے میں کس دیتا ہے۔

(نوائے وقت۔ مئی ۱۹۵۵ء)

غرض یہ کہ موجودہ دنیا میں مزدوروں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں، وہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے دیئے گئے ہوں یا روس و چین کی طرف سے ان کی معاشی ترقی، سماجی آزادی اور مستقبل کے لیے بہت زیادہ قابل اطمینان نہیں ہیں۔

سرمایہ دار ملکوں میں مزدور کو اس بات کی آزادی تو ضرور ہے، کہ وہ جس

اُجرت پر چاہے کام کرے، اگر اس کو کہیں اُجرت کم ملتی ہے، تو وہ دوسری جگہ اس سے زیادہ اُجرت پر کام ڈھونڈے، یا اگر اس کا جی چاہتا ہے تو وہ چار دن چھٹی لے کر آرام کرے مگر کمیونسٹ ملکوں میں یہ چیز ناممکن ہی نہیں، بلکہ ایسا کرنے والا فوجی عدالت کا مجرم قرار پائیگا۔

اُجرت کا اشتراکی تصوّر اشتراکیوں کے نزدیک پیداوار کا اصل عامل محنت ہے، مگر اس عامل سے کام لینے کے لئے چوں کہ انتظام کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے دوسرے درجہ پر وہ تنظیم کو تسلیم کرتے ہیں، اس تصور کی بنا پر جب ملک میں اشتراکی نظام قائم ہوتا ہے، تو سب سے پہلے وہ تقابلی صنعت و حرفت اور کارخانہ میں انفرادی اجارہ داری کو ختم کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ساری خرابیوں کی جڑ تقابلی ذہنیت اور انفرادی اجارہ داری ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک انفرادی اجارہ داری اور تقابلی صنعت کا نظام ختم کر کے ساری اجارہ داری حکومت کے سپرد نہ کر دی جائے، اور عام لوگوں کے لئے یہ اصول نہ بنا دیا جائے کہ وہ بس حکومت کی مرضی کے مطابق محنت کریں، اور اس کی دی ہوئی روزی کھائیں، اس وقت تک نہ تو مکمل اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ معاشی خوش حالی پیدا ہو سکتی ہے، چنانچہ گذشتہ سالوں میں جہاں بھی کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی ہے اسی روش پر چلنے کی کوشش کی گئی ہے، اگرچہ اس میں ان کو پورے طور پر کامیابی نہیں ہوئی اور ناچار کسی نہ کسی درجہ میں تقابلی صنعت اور انفرادی اجارہ داری کو برداشت کرنا پڑا مگر وہ کہتے اب بھی یہی بات ہیں۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ جہاں تقابلی صنعت اور اجارہ داری کا دور دورہ ہے اس میں سرمایہ دار جب چاہتے ہیں۔ ملک میں مصنوعی معاشی صورت حال پیدا کر دیتے اور جب چاہتے ہیں ہزاروں آدمیوں کو بیکار کر دیتے ہیں، مگر اس کی اصلاح کا جو طریقہ اشتراکیت اختیار کرتی ہے اس سے اصلاح تو کم ہی ہوتی ہے، البتہ نقصانات بے شمار ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پچاس، ساٹھ سال گذر جانے کے باوجود اشتراکیت اپنے اصول کو عملی جامہ

نہ پہنا سکی، بلکہ اس کو اپنے اصول سے کچھ نہ کچھ پیچھے ہی ہٹنا پڑا،

اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص سے محنت لی جائے، اور اس کی ضروریات کے مطابق اس کو اُجرت دی جائے، مگر اب تک ایک دن کے لئے یہ دعویٰ عملی جامہ نہیں پہن سکا، اوپر آپ نے عام محنت کش اور مزدور طبقہ اور حکومت کے دوسرے کارکنوں کی تنخواہوں میں جو فرق ملاحظہ کیا ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس ملک میں پیدا وار کے دوسرے عوامل Factors of Production کو ختم کر کے محنت ہی کو سب کچھ قرار دیا گیا ہو، وہاں خالص محنت کی عزت افزائی یہ ہے کہ وہاں کے مزدور اجرت متعارفہ[1] کی اتنی مقدار پانے کے باوجود اُجرت صحیحہ[2] کے فوائد سے بہرہ مند نہیں ہیں۔

عام طور پر اشتراکیت نواز یہاں پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر روس نے محنت کی عزت افزائی نہیں کی ہے اور وہاں کا محنت کش طبقہ مطمئن نہیں ہے، تو پھر ملک نے معاشی، سیاسی اور فوجی حیثیت سے اتنی ترقی کیسے کی، کہ دنیا کی دوسری طاقت بن گیا، مگر یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو دنیا کے مختلف ملکوں کی سیاسی اور فوجی طاقت سے واقف نہیں ہے، یا وہ موجودہ دور میں حکومت کے دائرہ اختیار و وسعت اور پنجۂ اقتدار کی قہرمانی کا علم نہیں رکھتا،

آج امریکہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے دنیا میں اول درجہ کا ملک مانا جاتا ہے، برطانیہ، فرانس، ناروے، سوئٹزرلینڈ معاشی اعتبار سے کسی کمیونسٹ ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ہٹلر نے جرمنی کو ۱۷-۱۸ سال میں جس حیرت انگیز طریقہ پر دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ملک بنایا اور اس کو فوجی اور سیاسی اعتبار سے جس طرح اول درجہ کی طاقت بخشی، اس سے کون انکار کر سکتا ہے مگر کیا فی الحقیقت آپ اس سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ امریکہ کی جمہوریت، برطانیہ کی شہنشاہیت اور نازی ازم میں کوئی خوبی ہے، اگر یہ بات صحیح نہیں ہے تو پھر یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہے، کہ روس نے جو ترقی کی، وہ کمیونزم کا کوئی فیض ہے، بلکہ یہ سب ڈکٹیٹر شپ کا فیض ہے

[illegible]

ڈکٹیٹرشپ خواہ فرد کی ہو یا ایک پارٹی کی ہو .... بھوڑے دنوں تک اس کے نتائج یہی نکلتے ہیں، اگر ہٹلر کی ڈکٹیٹرشپ ختم ہوگئی اور روس کی پارٹی، ڈکٹیٹرشپ کے نتائج کچھ دیرپا نظر آتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ یہ انسانیت کے لئے رحمت ہے، اشتراکیت جس ملک میں جڑ پکڑتی ہے وہاں کے سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کو صنعت و معیشت کے ہر ہر شعبے سے بے دخل کر کے ساری اجارہ داری حکومت کے ہاتھ میں دے دیتی ہے، اس کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ مزدوروں کے رزق کی کنجی بہت سے ارباب سے نکل کر ایک رب الارباب کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے، جس کا ملک میں نہ تو کوئی ہمسر ہوتا ہے اور نہ مقابل نہ اس کے مقرر کردہ معیار اُجرت میں چون وچرا کی گنجائش ہے اور نہ اس کی کہیں اپیل کی جا سکتی ہے، پھر حکومت کی اجارہ داری سے یہی نہیں کہ مزدوروں کو پیشہ کے انتخاب، اُجرت کی تعین اور اس کے لئے مطالبہ اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ختم ہو جاتی ہے بلکہ صنعتی و معاشی حیثیت سے بھی یہ چیز زیادہ مفید نہیں ہے، جہاں صنعتی مقابلہ تجارت میں آزادی، اور پیشہ کے انتخاب کا حق مزدوروں کو حاصل ہے، خواہ مخواہ وہاں کی صنعت و تجارت ان ملکوں کے مقابلہ میں بہتر ہوگی، جہاں ہر چیز پر پابندی اور جبر و زور ہے ایک شخص کو اپنے ذاتی کاروبار سے جو دلچسپی اور اس کو کامیاب بنانے میں جو انہماک ہو گا وہ ایک کرایہ کے آدمی اور ایک "معاشی قیدی" میں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ روس اپنی صنعتی چیزوں میں جاپان کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آخر جاپان کو کس کمیونزم نے آگے بڑھایا ہے۔

کمیونسٹ ملکوں میں خود حکومت ہر شخص کے مناسب حال کام تجویز کرتی ہے، مگر یہ چیز بالکل ہی ناممکن ہے کہ ہر ہر شخص کی صحیح فطرت کا اندازہ کوئی دوسرا لگائے اپنی طبیعت اور رجحان کے بارے میں خود آدمی کا ذاتی فیصلہ ہی زیادہ موزوں ہوتا ہے

پھر صلاحیتوں کا معاملہ کبھی یکساں نہیں ہوتا، بسا اوقات ایک آدمی مزدوری کرتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دستی کام کے بجائے صنعتی کام کے لئے زیادہ موزوں ہے، چنانچہ وہ کام شروع کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جہاں یہ فیصلہ حکومت کرتی ہے، اور جبراً اس کو نافذ کرتی ہے، اس کے بارے میں تبدیلی کا کیا امکان ہے، اگر ہو بھی تو ایک آدمی کی طبیعت کا صحیح صحیح اندازہ لگانا دوسرے کے لئے بالکل ہی ناممکن ہے، ایسی صورت میں اس میں بددلی پیدا ہوگی جس کے نتیجہ میں یا تو کام خراب کریگا یا پھر جی لگا کر کام نہیں کرے گا، بہرنوع جو صورت بھی ہو صنعتی پیداوار کے لئے محنت پر کنٹرول مضر ثابت ہوگا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت سے کہکر اپنے پیشے کو جب چاہے تبدیل کر سکتا ہے، چونکہ کمیونسٹ ملکوں میں اس طرح کی باتیں شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، اور یہ تبدیلی بہت سی دقتوں کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اس لئے بہت کم لوگ اس کی جرأت کر سکتے ہیں، چنانچہ کمیونسٹ چین نے محنت کے جو اصول اپنے ملک میں نافذ کئے ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے اس سے آپ کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں میں پیشہ کی تبدیلی کس قدر مشکل چیز ہے، جس ملک میں لاکھوں آدمیوں کو اس جرم میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، جہاں اونچے سے اونچے آدمی کو ذاتی اختلاف کی بنا پر غدار قرار دے کر پھانسی[1] دی جا سکتی ہے، اس میں اس کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی کمیونسٹ ملک صنعتی میدان میں ان ملکوں سے آگے نہیں جا سکا

---

[1] اس کی مثال بیریا اور اس کے ساتھیوں کی پھانسی ہے بیریا کے ساتھ تو یہاں تک ظلم کیا گیا کہ روس کی سڑکوں، عمارتوں حتی کہ روسی انسائیکلوپیڈیا سے بھی اس کا نام نکال دیا گیا گویا روس میں اس نام کا کوئی آدمی پیدا ہی نہیں ہوا یہی معاملہ قریب قریب اسی وقت موت کے بعد اسٹالن کیساتھ کیا جا رہا ہے اور یہی معاملہ وہاں مولوٹوف، مالنکوف اور کاگانوچ خرد شچیف کیساتھ کیا گیا ہے۔

جہاں صنعتی آزادی ہے، حتیٰ کہ شکست خوردہ جرمنی و جاپان کے مقابلہ میں بھی انکو کوئی امتیاز حاصل نہیں رہا ہے۔

اُجرت کے اقسام

یہ ایک حقیقت ہے کہ تقسیم دولت کے سلسلہ میں اس وقت سب سے نازک اور اہم مسئلہ محنت کی تعین و تقسیم اور اجرت کے معیار کا تقرر ہے معیار اجرت کی ممکن صورتیں یہ ہیں۔

۱ ——— ضرورت کے لحاظ سے اجرت۔

۲ ——— مہارت اور زحمت و مشقت کے لحاظ سے اجرت۔

۳ ——— کارکردگی کے لحاظ سے اجرت۔

۱۔ اگر احتیاج و ضرورت کے لحاظ سے اجرت کی تعین کی جائے، تو بظاہر یہ صورت بہت سادہ اور عمدہ معلوم ہوتی ہے، مگر اس صورت میں بھی ہر شخص کو مساوی حصہ ملنا چاہیئے کمیونزم کا دعویٰ نظری طور پر یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق اجرت دی جائے، مگر کسی کمیونسٹ اسٹیٹ میں ایک دن بھی اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے، اور نہ واقعی کسی مادی تصور حیات رکھنے والے ملک میں یہ ممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشیاء کے استعمال اور تمتع کی صلاحیتیں طبائع اور مذاق، مختلف جماعتوں، گروہوں، بلکہ ہر ہر فرد کا مختلف ہوتا ہے، اس لئے ضرورتوں اور احتیاجات کی بھی بے شمار قسمیں ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ ذکی الحس ہوتے ہیں ان کے لئے سادہ غذا، سادہ لباس اور بے رونق ماحول، ایک متوسط اور کم احساس رکھنے والے آدمی کے مقابلہ میں تکلیف کا موجب ہوتا ہے، اور اس طرح کے افراد ہر طبقہ اور ہر گروہ میں ہوتے ہیں، اگر تھوڑی دیر کیلیے ایسے شخص کو نظر انداز کر دیا جائے تو کیا ایک دستی کام کرنے والے مزدور کے مقابلہ میں ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کو اس سے اچھی غذا اور صاف ستھرا ماحول درکار نہ ہوگا۔

پھر فطری طور پر ہر شخص کی خواہشیں اور آرزوئیں جدا جدا اور بے شمار ہوتی ہیں، کسی کو عمدہ کپڑے اور اچھے کھانے کی خواہش ہوتی ہے کوئی عزت اور شہرت کو پسند کرتا ہے، کوئی اقتدار کا بھوکا ہوتا ہے، کوئی سیر و شکار کو پسند کرتا ہے۔ پھر جہاں پر تکمیل خواہش اور نفس پرستی کی .... ہمت افزائی کی جاتی ہو، اور بغیر قانون کے ان کی تحدید کی کوئی دوسری صورت نہ ہو وہاں پر ان میں اختلاف اور ٹکراؤ پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے اور ایسا ہو رہا ہے۔

اشتراکیت کے وکیل عموماً اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ خواہش کی شدت اور تمتع پذیری کے اختلافات زیادہ تر عادت کے ماتحت ہوتے ہیں، جو لوگ آرام و آسائش کے عادی ہوتے ہیں ان کی اسی طرح کی تربیت ہوتی ہے، اور اس لئے ان میں اس طرح کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے، اس بنا پر اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے یہ صحیح ہے کہ موجودہ معاشرہ میں کچھ خواہشیں اور ضرورتیں عادت کے تحت آسکتی ہیں، مگر جب تک کہ سب کے لیئے ایک معیار زندگی نہ مقرر کر دیا جائے اس کی تعین اور اس میں تبدیلی ناممکن ہے ایکطرف تو ان ممالک میں معیار زندگی، اجرت اور حیثیت کا فرق موجود ہے، دوسری طرف نفس پرستی اور تکمیل خواہش کے مواقع فراہم کیئے جاتے ہیں، پھر اس کے ساتھ آپ یہ توقع رکھیں، کہ ان لوگوں کی خواہشوں میں ہمواری اور ہم آہنگی پیدا کر دی جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟

اس سے قطع نظر کہ افراد و اشخاص میں فطری و طبعی طور پر بعض اختلافات ہوتے ہیں جن کو کسی طرح نہیں مٹایا جا سکتا، بسا اوقات ایک ہی ماحول بلکہ ایک ہی گھر میں پلے ہوئے دو آدمیوں کے مذاق اور افتاد طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے کوئی جانفشانی اور محنت و مشقت کو پسند کرتا ہے اور کسی کو دماغی کام بھاتا ہے اس اعتبار سے دونوں کی ضروریات میں بھی فرق ہوتا ہے، ایسی صورت میں آپ کس

کی ضرورت کو اجرت کا معیار قرار دیں گے۔

اس وقت کمیونسٹ ملکوں میں ضرورت کے لحاظ سے اجرت نہیں دی جاتی، بلکہ زیادہ تر دوسرے اور تیسرے طریقۂ اجرت پر عملدرآمد ہے، یعنی مہارت اور زحمت و مشقت کے اعتبار سے یا کارکردگی کے اعتبار سے مگر یہ دونوں طریقے بھی متعدد خرابیوں کے حامل ہیں، خصوصیت کے ساتھ دونوں طریقۂ اجرت کی وجہ سے معاشی طبقہ بندی اور ناہمواری پیدا ہونا یقینی ہے، جیسا کہ اوپر کے اعداد و شمار سے واضح ہو چکا ہے، اور جب تک ناہمواری موجود ہے اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعی محنت کو دوسرے عوامل (پر فوقیت) ہے۔

اشتراکیت میں ایک دوسرا اہم مسئلہ منتظموں کے انتخاب کا بھی ہوتا ہے، یوں تو یہ مسئلہ باشندگان ملک کے ہر طبقہ کے لئے اہم ہے مگر خاص طور سے مزدوروں کی زندگی کی خوشی و مسرت کا دارومدار اسی پر ہے۔ کمیونسٹ ملکوں میں کارکنوں اور منتظموں کا انتخاب خود حکومت کرتی ہے ان سے اگر کسی مزدور کو اجرت کے سلسلہ میں شکایت پیدا ہو جائے تو اس کے رفع کرنے میں اس سے زیادہ دقت اٹھانی پڑتی ہے جتنی کہ پاکستان و ہندوستان کا کوئی مزدور اٹھاتا ہے، بلکہ وہاں تو ہر وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سا مزدور دل سے کام کر رہا ہے، یا وقت گزاری کر رہا ہے، ایسی صورت میں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ جب تک وہ منتظم بالا تک اپنی شکایت پہونچائے اس سے پہلے منتظم نے افسر بالا سے خود اسی کی شکایت نہ کر دی ہو، اور جب وہ اپنی شکایت لے کر جائے تو مجرم بنا کر جیل میں ڈال دیا جائے۔

اس کے امکانات ان ملکوں میں اس لئے زیادہ ہیں کہ وہاں پر انفرادی ذہنیت، نفع پرستی، اور خود غرضی ہی پر سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے، ایسی صورت میں کسی سے ہمدردی اور بہی خواہی کے جذبہ کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ پھر یہی کارکن ان کی اجرت کا تعیّن کرتے

ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ وہ بہت ہی محنتوں کی قیمت کم لگائیں، یا زیادہ لگا کر خود رشوت ستانی شروع کر دیں جیسا کہ اس وقت عملاً روس میں ہو رہا ہے، تو اس کے دفعیہ کی کیا توقع ہے

اس مسئلہ میں سب سے زیادہ ضرورت کارکنوں کے دل سے خود غرضی اور نفع پرستی نکالنے کی ہے مگر اس نظام سے اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے جس نے اخلاق اور روحانیت کو جس سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے پہلے ہی دن ٹھکرا دیا ہو، اس لئے ان کو کبھی وطنیت اور کبھی جذبہ قومیت کا سہارا لینا پڑتا ہے، اس وقت تمام کمیونسٹ ملکوں میں یہی دونوں جذبے کام کر رہے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ جذبہ آدمی کو جان دینے پر آمادہ کر سکتا ہے، مگر اس میں بھائی چارہ، ہمدردی اور ایمانداری پیدا نہیں کر سکتا، عموماً اشتراکیت نواز کہتے ہیں کہ اس میں موثر شئے یہ ہے کہ کارکنوں اور قائدوں میں اولی العزمی پیدا کی جائے، حب جاہ اور امتیاز کی خواہش کی تسکین پذیری کے نئے نئے طریقے معلوم کئے جائیں، وہ جن چیزوں کی خواہش رکھتے ہیں ان کیلئے وہ مہیا کر دی جائیں، مثلاً شہرت، نیک نامی، مرتبہ اور اقتدار وغیرہ

ممکن ہے کہ یہ چیزیں کچھ لوگوں کے لئے موثر ثابت ہوں، مگر کیا واقعی اس طریقہ سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ان کی ذہنیت میں ایسی تبدیلی ہو گی جو مزدوروں کے لئے مفید ہو، حب جاہ، امتیاز کی خواہش شہرت و نیک نامی اور اقتدار کے حصول میں ایک دوسرے کے خلاف رشک و رقابت کا جو جذبہ ابھریگا اس سے کیا ان میں کش مکش نہ ہو گی، جمہوری ملکوں میں کم از کم مزدوروں کو اس بات کی آزادی تو ہوتی ہے کہ اگر کارخانہ دار سے ان کو شکایت ہو اور وہ اسے رفع نہ کرے تو وہ اپنی انجمنوں یا ملک کی کسی سیاسی پارٹی کے ذریعہ برملا اس کا اظہار کر سکتے ہیں، اور بسا اوقات ان کو اس میں کامیابی بھی ہو جاتی ہے مگر کسی کمیونسٹ ملک میں ان کو چون و چرا کرنے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ خود حکومت ہی کارخانہ دار اور منتظم ہوتی ہے، اس کے خلاف شکایت کرنے یا مظاہرے کرنے کے معنی ملک سے غداری کے ہیں، اور چونکہ وہاں کوئی دوسری سیاسی پارٹی نہیں

ہوتی اس لئے اس کا سہارا لینے کی بھی کوئی سبیل نہیں ہے، ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے جذبات کا عملاً کوئی مظاہرہ نہ کرسکیں گے، تو ان کے دبے ہوئے جذبات اس کے ظہور کی غلط راہیں نکالیں گے، جن سے معاشرہ کی جڑیں اندر ہی اندر کھوکھلی ہوتی رہیں گی، یہی وجہ ہے کہ اس وقت اشتراکی معاشرہ میں رشوت، خیانت، چوری، غبن اور اسی طرح کی دوسری برائیاں کثرت سے پیدا ہو رہی ہیں، ۱۹۵۵ء میں صفائی کی مہم روس میں شروع کی گئی تھی اس میں، ۷ لاکھ کارکن مختلف محکموں میں سے نکالے گئے، مختصر یہ کہ جب تک کارکنوں کی ذہنیت تبدیل نہ ہو اس وقت تک نہ تو مزدوروں کی محنت ٹھکانے لگ سکتی ہے، اور نہ واقعی طور پر اجرت کی منصفانہ تقسیم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی بہتر معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

کمیونسٹ ملکوں، اور خاص طور سے روس کے سوشل انشورنس کی بڑی تعریف کی جاتی ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ مزدوروں کی حیثیت معاشی اور سماجی اعتبار سے دوسرے طبقہ کے مساوی ہو گئی ہے، مگر یہ بات انتہائی مبالغہ سے کہی جاتی ہے،

سوشل انشورنس کا فنڈ روس میں جس طریقہ سے فراہم کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر ادارے کا نظم و نسق بحیثیت مجموعی جتنی رقم کارکنوں کے معاوضہ پر صرف کرتا ہے، اس کا دس فی صدی سے لے کر بیس فی صدی تک اسے مخصوص قاعدہ کے مطابق سوشل انشورنس اسکیم کے حساب میں جمع کر دینا ہوتا ہے گویا سوشل انشورنس کی اس اسکیم میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے وہ مزدوروں کی جیب یا ان کی محنت کی کمائی ہی سے لیا جاتا ہے، سرمایہ دار ملکوں میں بھی سوشل انشورنس کا قریب قریب یہی

نظام ہے، مگر وہاں مزدور اپنی مرضی سے ایسا کرتا ہے، اور یہاں بجبر ایسا کرنا پڑتا ہے
پھر یہ رقم جو اس فنڈ میں جمع کی جاتی ہے وہ قومی آمدنی کا ایک یا ڈیڑھ فی صدی سے

زیادہ نہیں ہے، اگر ان کی تنخواہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان پر جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ
قومی آمدنی کا مشکل سے ۔ افیصد ہے، بقیہ یا تو افسروں کی بڑی تنخواہوں اور ان
کے آرام و آسایش پر صرف کیا جاتا ہے، یا جنگی سامان کی تیاری پر۔

یہ ہے مزدوروں کی حالت اور محنت کی قدر" اس معاشی جنت میں" جو صرف
انہی کے لئے بنائی گئی ہے، اور جس کے بنانے کے لئے باشندگان ملک کو مذہب،
اخلاق، جان و مال کی ایسی بے بہا اور زبردست قربانی دینی پڑی کہ اس کے تذکرے
سے اب بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اب بھی اس کا سلسلہ بند
نہیں ہوا ہے۔

اجرت کے موجودہ نظام میں معاشی خرابیوں کے ساتھ کچھ سماجی اور اخلاقی
خرابیاں بھی ہیں، جو انتہائی افسوس ناک ہیں۔

۱ ۔ مزدور پیشہ طبقہ کو عام طور پر سماج میں وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو ملک
کے دوسرے طبقہ کو حاصل ہوتا ہے، جس سے مستقل طور پر ایک طبقہ وارانہ ذہنیت
فروغ پاتی ہے، خاص طور سے کمیونزم تو اس ذہنیت کو عملاً فروغ دینے کی کوشش کرتا
ہے، اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ مزدوروں کو جہاں آزادی ہے وہاں وہ تشدد
پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جہاں ان کو اس کا موقع نہیں ہے، وہاں ان کی ذہنی صلاحیت
پر اس کا اثر پڑتا ہے۔

۲ - ہر ملک میں ایک اچھی خاصی تعداد خانگی ملازموں اور اجیروں کی اور بھنگی کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہے، کسی نظام نے بھی ان کو نہ تو کوئی خاص دستوری حق دیا ہے، اور نہ ان کی اجرت کے تحفظ کا کوئی انتظام کیا ہے، یہ سراسر آجر اور مالک کی مرضی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

۳ - اسی طرح ایک مسئلہ غیر ملکی اجیروں کا بھی ہے، یوں تو ہر زمانہ میں ایک ملک کے باشندے دوسرے ملکوں میں حصول رزق کے لئے جاتے رہے ہیں مگر اس زمانہ میں ذرائع نقل و حمل کی وسعت اور سفر کی سہولت نے اس میں بہت زیادہ وسعت پیدا کر دی ہے، آج دنیا کے کسی دستور میں ان کے لئے کوئی ایسی گنجائش نہیں ہے جس کی رو سے وہ آسانی سے کسی ملک میں جا سکیں اور ان کو آسانی سے وہاں ذرائع رزق مل سکیں، اور نہ وہاں وہ اپنے کو اجنبی اور غریب الدیار محسوس نہ کریں، کمیونسٹ ملکوں میں تو خیر اس کی گنجائش سرے سے ہے ہی نہیں ان جمہوری ملکوں میں جہاں غیر ملکی مزدوروں اور پیشہ وروں کو جانے اور ذریعہ معاش تلاش کرنے کی قانونی اجازت ہے، وہاں بھی نہ تو روزی کی کوئی سہولت ہے، اور نہ سماجی حیثیت سے وہاں ان کو کوئی مقام حاصل ہو سکتا ہے، وہاں پر وطنیت اور قومیت نے لوگوں کو ایسا اندھا کر رکھا ہے کہ وہ رنگ و نسل کے اختلاف کو مشکل سے برداشت کر سکتے ہیں، چنانچہ یہی جذبہ ہے کہ امریکہ میں آج تک حبشیوں کو عام شہریوں کے بھی حقوق حاصل نہیں ہو سکے،

اُجرت کا اسلامی نقطۂ نظر

اجرت کے سلسلہ میں جن ناہمواریوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان سب کا ایک متوازن، اور معتدل حل اسلامی نظام اجرت میں موجود ہے، اسلام میں اجیروں اور محنت کش طبقہ کو جو حقوق دیئے گئے ہیں ان میں نہ تو بے قید معیشت کی اجارہ داری پیدا ہونے پاتی ہے، کہ مزدور چند افراد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہے اور نہ اس نے جبری معیشت کا غیر فطری طریقہ اختیار کیا ہے، کہ مزدور اپنے کو معاشی جیل خانہ میں محبوس سمجھے، اس نے نہ تو محنت کے علاوہ دوسرے عوامل پیدائش (Factors of Productions.) سرمایہ، زمین اور تنظیم کا سرے سے انکار کیا ہے، جیسا کہ اشتراکی کرتے ہیں، اور نہ محنت کو ان عوامل کا ایسا تابع بنا دیا ہے کہ وہ اہل سرمایہ کے غلام بن کر رہ جائیں، جیسا کہ جمہوری ملکوں میں ہو رہا ہے۔

اسلام نے ایک طرف تو عام معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، دوسری طرف عوامل پیدائش کے جتنے اعضا ہیں ان میں ربط و تعلق پیدا کیا ہے، اور پیدائش دولت کا ایسا متوازن نظام بنایا ہے جس سے نہ تو کسی عامل کی حق تلفی ہوتی ہے اور نہ کوئی کسی کے ہاتھ مجبور ہونے پاتا ہے خصوصیت سے دستی محنت کرنے والوں کو اس نے جو وقعت عطا کی ہے اور ان کو جو حقوق دیئے ہیں اس کی مثال کسی مذہب یا کسی مادی نظام حیات میں نہیں ملتی، پھر وہ ایک ایسی اخلاقی حس پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے ان میں وہ مفاد پرستانہ اور خود غرضانہ ذہنیت پیدا نہیں ہونے پاتی، جس کی وجہ سے خواہ مخواہ محنت اور سرمایہ میں کشمکش پیدا ہو اور اس کے نتیجہ میں وہ اسٹرائک کریں اور ملک کی صنعت کو نقصان پہنچے،

اگر کبھی اس کی نوبت آجائے تو وہ یہ اجازت نہیں دیتا کہ حکومت ایک تماشہ بین کی حیثیت سے دونوں کی کشتی دیکھتی اور لطف اٹھاتی رہے۔ بلکہ وہ پہلے ہی قدم پر اس میں مداخلت کرکے اس کا کوئی حل نکالے گی اور یہ اس کا فرض ہوگا، مزدوروں یا کسی ایک ہی فریق پر اس کی مہربانی اور عنایت نہیں ہوگی، پھر اس کے ساتھ وہ کارکنوں، منتظموں اور اصل اداروں میں ایک ایسا ہمدردانہ اور خیرخواہانہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ محنت کشوں کے حقوق کو پامال کرنے کے بجائے ان کے حقوق کے محافظ بن جائیں اور ان کو اپنے حقوق مانگنے کی ضرورت نہ پیش آئے، بلکہ وہ خود ان کے حقوق انہیں دیں، اور ایسا کرنے پر وہ اخلاقی طور پر مجبور ہوں، اور قانونی طور پر بھی اس لئے کہ یہ بات ان کے ذہن نشین ہوگی کہ اگر انہوں نے مزدور کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو وہ مجبور نہیں ہے کہ لامحالہ ان کے در کی جبہ سائی کرے بلکہ اس کے ساتھ پورے معاشرہ کی اور پھر حکومت کی پوری ہمدردی ہوگی۔ حکومت ان کو غیر سودی قرضہ اور مدد دینے کیلئے، ہر وقت تیار رہے گی، اس کو اپنے بچوں کی تعلیم، ان کی بیماری اور دو وقت کی روٹی کی فکر اس بات پر مجبور نہیں کرے گی کہ وہ اپنی محنت کو مجبوری اور ذلت کے ساتھ فروخت کرے، وہ معمولی اور خانگی ملازموں کو بھی قانون میں وہی درجہ دیتا ہے جو ملک کے دوسرے طبقوں کو حاصل ہے۔ اسلام ایک معتبر ایک خانگی ملازم کو محض قانونی اعتبار سے مساویانہ درجہ نہیں دیتا بلکہ وہ معاشرہ میں ایسی اخلاقی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے کو معاشرے کے دوسرے افراد کے مساوی محسوس کرتا ہے۔ مسلمانوں کی اس بگڑی ہوئی حالت میں بھی اس کا مظاہرہ کم از کم مسجدوں میں تو اب بھی ہوتا ہے۔

پھر وہ غیر ملکی اجیروں کے لئے بھی اگر وہ کسی ایسی قوم کے ہیں جس سے جنگ جاری ہو، فرد نہیں ہیں تو بغیر کسی نگرانی اور پابندی کے ملک کے اندر آنے کی اجازت نہ دیتا

ہے، ہاں اگر کوئی شخص کسی متحارب قوم کا فرد ہے تو پھر اس کو اجازت (امان) لینے کی ضرورت پڑے گی، اور حکومت اس کی نقل و حرکت کی نگرانی بھی کریگی مگر یہ بہرحال نہیں ہوگا کہ محض رنگ و نسل کے اختلاف یا وطنی مغایرت کی بنا پر اس کو ان حقوق سے محروم کیا جائے جن پر اس کی معاش کا دارومدار ہے، آج ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک میں چوروں اور مجرموں کی طرح رہتا ہے وہاں یہ چیز نہ ہوگی، بلکہ ہر شخص یہ کہہ سکے گا کہ۔

ع ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

بعض ائمہ نے ان غیر مسلموں سے جو اسلامی ملک کے باشندے نہ ہوں، معاملہ کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، مگر امام ابو یوسف نے اس کی بڑی شدید مخالفت کی ہے، اور اجازت دی ہے۔ اس اختلاف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں دونوں پہلو نکل سکتے ہیں، عام حالات میں تو ان سے معاملہ کرنے کی اجازت ہوگی مگر خاص حالات میں، ان کو پابند بھی کیا جا سکتا ہے، مثلاً حالت جنگ میں، یا جاسوسی وغیرہ کی صورت میں۔

غرض معاشی، سماجی جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے، اسلام کا نظام اجرت نہایت ہی معتدل، مکمل اور حد درجہ منصفانہ ہے، مگر اسلامی نظام اجرت کی تفصیل سے پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات جو ذہن میں حاضر رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اجرت کا مسئلہ اسلامی معاشیات کا ایک جزو اور ایک شعبہ ہے، اور خود معاشیات بھی پورے اسلامی نظام حیات کا ایک جز ہے، کل نہیں ہے، اس لئے اسلامی نظام اجرت کی روح کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آدمی اسلامی معاشیات اور پھر اسلامی نظام حیات کی ان بنیادی خصوصیات کو بھی پیش نظر رکھے جن پر اسلام انسانی معاشرہ کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، جب تک اسلامی نظام حیات کی

بنیادی خصوصیات آپ کے سامنے نہ ہوں گی تو ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں اس کی پوری افادیت نہ بیٹھے اگر اس وقت عملاً کوئی مکمل اسلامی معاشرہ موجود ہوتا تو پھر کہنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اس کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی تھا مگر بدقسمتی سے اس وقت کوئی ایسا معاشرہ موجود نہیں ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کی نمایندگی کرتا ہو اس لیے اس بات کی طرف سے توجہ نہ ہٹنی چاہیئے۔

(۲)۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اگر آپ اسلامی نظام اجرت کو کسی دوسرے مادی نظام معیشت میں فٹ کرنے اور پھر اس کی افادیت معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ تو اسلامی نظام اجرت کے ساتھ آپ ناانصافی کریں گے۔ اور یہ بات بالکل ایسی ہی ہو گی جیسے انسانی جسم کے کسی حصہ کو کسی جانور کے جسم میں جوڑ کر پھر انسانی جسم کے اس حصہ میں تناسب کی کمی پا کر آپ اس عضو کے غیر مناسب ہونے کا شبہ ظاہر کریں۔

(۳)۔ تیسری بات جو ذہن میں تازہ رہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اسلام مستاجر، اصل دار اور اہل سرمایہ کے وجود اور ان کی مستقل بالذات حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، جس طرح ایک آدمی کا یہ فطری حق ہے کہ وہ خود ذاتی طور پر جو کام چاہے کرے اور جو پیشہ چاہے اختیار کرے، اور اس سے اپنی روزی کمائے، اسی طرح یہ بھی اس کا فطری حق ہے ایک آدمی چند آدمیوں کو مزدوری پر رکھ کر ان کی محنت سے کوئی کاروبار کرے یا کارخانہ چلائے اور ان کو ان کی اجرت دے، اسلام اس کو بھی انسان کا ایک فطری حق سمجھتا ہے، اور اس کی اس آزادی

پر اس وقت تک کوئی پابندی نہیں لگاتا، جب تک اس کی روش یا اس کا کاروبار اخلاقی یا معاشی حیثیت سے معاشرہ کیلئے ضرر رساں نہ ہو اور نہ وہ حکومت ہی کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ بہت سے مستاجروں کی اس آزادی کو چھین کر خود مستاجر بن بیٹھے، اور بہت سے سرمایہ داروں کو ختم کر کے خود ایک بڑی سرمایہ دار بن جائے۔

(۴) ۔ چوتھی چیز جو مسئلہ اجرت کے سمجھنے سے پہلے سامنے ہونی چاہیئے، یہ ہے کہ اسلام نے اجرت کا جو نظام بنایا ہے، اس نے محض قانون ہی کو آخری سہارا نہیں قرار دیا ہے، اور نہ محض ظاہری طور پر مزدوروں کیلئے کچھ مسرتیں فراہم کرنا ہی اس کا نصب العین ہے ۔ بلکہ وہ اجیروں، مستاجروں اور کارکنوں کی اخلاقی حس کو بھی بیدار کرتا ہے اور ان کے قلب میں خوف خدا، خوف آخرت بھی پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے ان میں خود غرضی نفع پرستی اور کشمکش کے بجائے انسانی ہمدردی، خیر خواہی اور مساوات، ایثار اور قناعت پسندی کا جذبہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے، اور اس وقت دنیا کے نظامہائے حیات میں سب سے زیادہ اسی چیز کی کمی ہے، جیسا کہ مشہور عالم معاشیات مسٹر ٹاسگ وو صنعتی امن واماں کے وسائل، کے تحت لکھتے ہیں ۔

بدقسمتی سے یہ جذبہ (ہمدردی اور بھائی چارہ) بہت کمیاب ہے اگر وہ عام ہو جائے تو معاشی دنیا کا رخ بدل جائے گا ۔

مگر مسٹر ٹاسگ کی یہ تمنا موجودہ نظاموں سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ان نظاموں کی ابجد ہی خود غرضی اور مفاد پرستی پر ہے، اس جذبہ کے پیدا کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے خوف خدا اور خوف آخرت ہے، اور اسلام سب سے پہلے انسان کے اندر یہی چیز پیدا کرتا ہے ۔

خوف خدا اور خوف آخرت کے ساتھ اسلام یہ تصور بھی انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دنیا میں جو چیزیں ہیں انسان ان میں سے کسی چیز کا خالق نہیں ہے بلکہ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ اس میں خدا نے جو افادیت رکھی ہے اس سے خود فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، گویا انسان کا کام تخلیق نہیں، بلکہ مخلوقات سے استفادہ ہے، حتیٰ کہ خود اس کا جسم جس سے وہ ہر وقت فائدہ اٹھاتا ہے، اس کے کسی حصہ کا وہ خالق نہیں ہے، بلکہ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ وہ اس سے جو چاہے اور جیسے چاہے فائدہ اٹھائے ظاہر ہے کہ جب انسان کسی چیز کا خالق نہیں ہے بلکہ وہ خود اور کائنات کی ہر چیز کسی خالق کی مخلوق ہے، تو پھر ان کے استعمال میں اسے آزاد نہ ہونا چاہئے اور نہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر اس حیثیت سے کوئی تفوق قائم کرنا چاہئے کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا رہا ہے، اگر ایک شخص کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ وہ ایک کارخانہ قائم کر کے لاکھوں مزدوروں سے کام لے، تو اس بناء پر اس کو مزدوروں پر کوئی تفوق حاصل نہ ہوگا کہ وہ کارخانہ دار ہے اس لئے کہ نہ تو وہ اصل کا خالق ہے، اور نہ محنت کا، بلکہ دونوں خدا تعالےٰ کا عطیہ ہیں، اس لئے اس حیثیت سے دونوں مساوی ہیں، محض موقع مل جانے کی وجہ سے کسی کے انسانی حقوق کم اور کسی کے زیادہ نہیں ہوں گے، اس لئے یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوگا کہ اصل (Capital.) کو ترجیح دنی چاہئے یا محنت کو ان میں سے کسی کو ایک دوسرے پر فی نفسہ کوئی ترجیح نہیں ہونی چاہئے، بلکہ دونوں میں توافق ہونا چاہئے، جس طرح کسی بچہ کی پیدائش میں یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ باپ، ماں میں کون زیادہ ضروری ہے، بھاپ کے پیدا کرنے میں آگ کا زیادہ حصہ ہوتا ہے، یا پانی کا، اسی طرح یہاں محنت اور

اصل کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل اور محنت میں ایک کو لامحالہ دوسرے پر ترجیح ہے، اس تصور سے بے قید معیشت کی وہ خرابی جو اصل کو ذرائع پیداوار کی بنیاد قرار دینے سے پیدا ہوتی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی، اور پابند معیشت کی وہ خرابی بھی نہیں رہے گی کہ جو اصل کو نظر انداز کر کے محنت ہی کو معاش کی بنیاد قرار دینے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۶)۔ یہ تصور موجودہ معاشیات میں افادہ اور احتیاج کی اصطلاح کو بھی بالکلیہ تسلیم نہیں کر سکتا یعنی یہ کہ جو چیزیں انسانی ضروریات اور خواہشات کو پوری کریں، اور ان میں استبدال (Substitution.) کی صلاحیت بھی موجود ہو وہ مفید ہیں، یا ان میں افادہ ہے۔ اشیاء میں افادہ کے موجود ہونے کا جہاں تک تعلق ہے اس میں انسان کو کوئی دخل نہیں ہے، شراب میں قوت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے، ریڈیم اور ایٹم میں بے شمار فائدے مضمر ہیں مگر اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی احتیاج اور خواہش کو جو چیز بھی پورا کرے وہ واقعی مفید بھی ہے؟ اس نظریہ اور اصول کو اسلام صحیح قرار نہیں دیتا اس لئے کہ انسانی خواہش اور ضرورتیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی، اس لئے محض ضرورت اور خواہش کو پورا کر دینا ہی افادہ کی شرط قرار نہیں دی جا سکتی، جیسا کہ موجودہ معاشیین کہتے ہیں بلکہ اس کے لئے یہ قید بھی ضروری ہے کہ واقعی وہ ضرورتیں اور خواہشیں صحیح بھی ہوں، یہی وجہ ہے کہ اسلام ضروریات اور خواہشات پر پابندی لگا کر اشیاء کو واقعی مفید بناتا ہے، آج اس قید کے نہ ہونے کی وجہ سے مستاجر اجیر سے اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق محنت لیتا ہے، اور اجیر اپنی خواہش اور ضرورت کے پیش نظر اجرت کیلئے مستاجر سے کشمکش کرتا ہے، اس لئے کہ اس میں دونوں کو افادیت نظر آتی ہے

ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کسی نہ کسی ضرورت اور خواہش کی تکمیل ہی کے لیئے تیار کیئے جاتے ہیں، اس لیئے ان کی صنعت فائدہ سے خالی نہیں، اسلام اشیا سے فائدہ اٹھانے کی ان تمام شکلوں کو ممنوع قرار دیتا ہے، جن سے کسی کی حق تلفی، صحت کی بربادی سیاسی یا معاشی کش مکش یا دولت کی بلا وجہ تباہی و بربادی ہوتی ہو۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افادہ اور احتیاج کی تحدید و تعین کون کرے گا، تو اس بارے میں اسلام اس کو انسانوں پر نہیں چھوڑتا ہے، بلکہ خود ہی اس کی حد اور ایک معیار مقرر کرتا ہے، اور وہ حد و معیار کوئی اضافی اور عارضی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک پائیدار اور اٹل حقیقت ہے، اس میں کسی وقت کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، مثلاً شراب کی افادیت اور اس کی خواہش، سود اور قمار بازی کا فائدہ اور اس کی ضرورت اس زمانہ میں شدت سے محسوس کیجاتی ہے مگر اسلام اس کو جائز نہیں قرار دیتا، اور یہ اس کا اٹل فیصلہ ہے، چونکہ یہ فیصلہ انسان کا نہیں بلکہ خالق انسان کا ہے، اس لیئے دنیا مدتوں ان چیزوں کی افادیت اور احتیاج کا یقین کرنے کے بعد آج اسلام کے اس اٹل فیصلہ کی طرف جانے پر مجبور ہو رہی ہے، خیال پیدا ہو سکتا ہے، کہ اسلام جب افادہ اور احتیاج پر پابندی عائد کرے گا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مبادلہ کی قوت اور تجارت کا میدان بہت سمٹ جائیگا۔

یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ موجودہ دور میں بے قید مبادلہ و تجارت کا جو رواج ہے، اسلام اس میں تبدیلی چاہتا ہے، اس لیئے کہ اس سے مزدوروں، غریبوں اور محنت کش طبقہ کی حق تلفی بھی ہوتی ہے، اور ملک کی کاروباری حالت ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے مگر اس نے مباحات[1] کا جو وسیع دروازہ کھولا ہے، اس سے

---

[1] یعنی ان تمام چیزوں کا استعمال جائز ہوگا جس سے شریعت نے صراحتاً نہ روکا ہو خواہ وہ خود اس کیلئے یا دوسروں کیلئے

یہ شبہہ بالکل نہیں کیا جاسکتا، کہ وہ چند ضرورتوں کے علاوہ انسان کی ہر خواہش اور ضرورت پر پہرہ بٹھا دیگا جیسا کہ معاشی و سیاسی حیثیت سے کمیونسٹ ملکوں میں ہوتا ہے۔

(۷) ۔ ساتویں چیز جو ذہن نشین کر لینی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ "اسلامی نقطۂ نظر سے اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا قوم یا معاشرہ کی، فرد جماعت کے لئے نہیں بلکہ جماعت فرد کیلئے ہے[1]، خدا کے سامنے کوئی جماعت یا قوم یا معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت سے ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ ایک ایک شخص فرداً فرداً اپنی ذاتی حیثیت میں ذمہ دار ہے، اور اس ذاتی ذمہ داری و جواب دہی میں انسان کی ساری اخلاقی قدر و قیمت ہے، اجتماعی زندگی سے اصل مقصود مجموعی خوش حالی نہیں ہے، بلکہ انفرادی فلاح ہے، ایک نظام جماعت کے صالح یا فاسد ہونے کا حقیقی معیار یہی ہے کہ وہ اپنے افراد کی شخصیتوں کے پھلنے پھولنے میں اور ان کی ذاتی صلاحیتوں کے بروئے کار لانے میں کس حد تک مددگار و معاون ہے یا مانع و مزاحم ہے، اس بنا پر اسلام اجتماعی تنظیم کی کسی ایسی صورت کو یا اجتماعی فلاح کی خاطر کسی ایسی تدبیر کو پسند نہیں کرتا جس سے افراد اجتماعی شکنجے میں اس حد تک کس دئے جائیں، کہ ان کی مستقل شخصیت و انفرادیت دب جائے، اور وہ بہت سے آدمیوں یا چند آدمیوں کے ہاتھوں میں بے روح اوزار بن کر رہ جائیں۔

---

[1] فاضل مصنف کی رائے محل نظر ہے۔ اسلامی معاشرہ میں فرد کے جماعت کے لیے اور جماعت کے فرد کے لیے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ فاضل مصنف کا یہ نقطہ نظر سرمایہ دارانہ نظریہ کی تائید کرتا ہے جہاں فرد شتر بے مہار ہے وہ جو چاہے کرے حتیٰ کہ سوسائٹی کا معاشی استحصال کر کے بھی زیادہ نفع کما سکتا ہے۔ اسی نظریہ نے اجارہ دارانہ معاشی کاروبار کو جنم دیا ہے۔ اسلام نے بخل و امساک ارتکاز و اکتناز وغیرہ پر قدغن لگا کر فرد کی خواہشات کو اسلامی سوسائٹی کے تابع کر دیا ہے (ادارہ)

انسان کی انفرادیت کا صحیح نشو ونما اور اس کی شخصیت کا پورا پورا ابھار بغیر اس کے ممکن نہیں ہے، کہ اس کو فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو، اس غرض کے لیے صرف آزادی رائے اور آزادی تحریر و تقریر ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ آزادی معاش بھی اتنی ہی ضروری ہے، یہ ایک فطری حقیقت ہے، جس کو ثابت کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث کی حاجت نہیں ہے، صرف عقل عام اس کا ادراک کرنے کیلئے کافی ہے۔ ایک راہ چلتا آدمی بھی اس بات کو خوب جانتا ہے کہ جس شخص کی معاش آزاد نہیں ہے اسے درحقیقت کوئی آزادی حاصل نہیں ہے، لہٰذا انسانیت کے لئے اگر کوئی معاشرہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے تو صرف وہ جس میں ایک بندۂ خدا کے لئے اس امر کے کافی مواقع موجود ہوں کہ اپنی ضمیر کو فروخت کئے بغیر اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے دو وقت کی باعزت روٹی پیدا کر سکے۔

اس بنا پر اسلام کسی ایسی زرعی، صنعتی یا تجارتی اسکیم یا منصوبہ بندی کی ہمت افزائی نہیں کر سکتا جس سے چند افراد جن کے ہاتھوں میں پہلے سے اسباب و ذرائع موجود ہوں، وہ اور زیادہ ذرائع و وسائل پر قابض ہو جائیں یا اس سے فائدہ تو کم لوگوں کا ہو مگر ملک کی دولت بے دریغ بہائی جائے یا وہ اپنی معاش کے معاملہ میں مشین کا ایک بے روح پرزہ بن کر رہ جائیں۔

(۸)۔ پھر فرد کی آزادی کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ حکومت کے دائرۂ اختیار اور قانون کی گرفت کم سے کم کیجائے اور اس کے بجائے افراد کی صلاحیتوں کے ابھرنے اور پروان چڑھنے کے پورے مواقع دیئے جائیں، مگر اس اخلاقی ذہنیت کے ساتھ کہ قانون کی گرفت نہ ہونے کے باوجود ہر ہر فرد میں احساس ذمہ داری، دوسروں کے حقوق کا خیال، حقیقی ڈسپلن ،، صنوعی نہیں جیسا

کہ یورپ میں ہے) ملک کی سچی خدمت کا جذبہ پورے طور پر موجود ہو، اس کی معاش آزاد ہو، اس کو ذرائع و وسائل کے اکٹھا کرنے کی پوری چھوٹ ہو، مگر وہ خود ایسا کوئی کام نہ کرے جو دوسرے بے وسیلہ لوگوں کے ذریعہ معاش کیلئے مضر ہو، یا اس سے ان کی انفرادیت ختم ہو، اب اگر کوئی فرد اس اخلاقی فضا کے باوجود ایسا کام کرتا ہے جو اس کے لیئے یا معاشرہ کے لئے کسی حیثیت سے مضر ہو تو یہاں سے حکومت کا کام شروع ہوتا ہے کہ وہ قانون کے ذریعہ اس کو راہ راست پر لائے یا اس کو اس کام سے روک دے، مگر اس سے پہلے اس کو ملزم سمجھ کر اس کی انفرادیت کو قانون کی زنجیر میں جکڑنا صحیح نہیں ہے، اگر ان مذکورہ بنیادی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر کوئی زرعی یا صنعتی یا تجارتی اسکیم بنائی جائے گی، تو محنت کش اور مزدور طبقہ میں وہ بے اطمینانی نہیں پیدا ہو سکتی، جو بے قید معیشت اور مجبور معیشت میں پیدا ہوتی ہے، ان حقائق کے پیش نظر صنعت و تجارت کو حسب ذیل باتوں کا پابند ہونا پڑے گا۔

(۱) ۔ کسی ایسی فنی ایجاد کو جو انسانی طاقت کی جگہ مشینی طاقت سے کام لیتی ہو، صنعت و حرفت اور کاروبار میں استعمال کرنے کی اس وقت تک اجازت نہ دی جائیگی جب تک کہ اس امر کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لیا جائے کہ وہ کتنے انسانوں کی روزی پر اثر ڈالے گی، اور یہ اطمینان نہ کر لیا جائے کہ ان متاثر ہونے والوں کی روزی کا کیا بندوبست ہو گا۔

(۲) ۔ اجیروں اور مستاجروں کے درمیان حقوق و فرائض اور شرائط کا تفصیلی تعین تو بہرحال فریقین کی باہمی قرارداد پر چھوڑا جائے گا، مگر ریاست اس معاملہ میں انصاف کے چند اصول لازماً طے کر دے گی۔

ا۔ کم سے کم مزدوری کا معیار۔

(۲) اوقات کار کی تحدید۔

(۳) بیماری کی حالت میں علاج۔

(۴) جسمانی نقصان کی تلافی۔

(۵) ازکار رفتہ ہو جانے کی صورت میں گذر اوقات کا سامان۔

(۶) ہنگامی ضرورتوں کے لیے امداد یا بے سودی قرضے کا انتظام۔

۳۔ اسلامی نظام معیشت میں آجر و مستاجر کی کش مکش کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے، مگر پھر بھی ان میں اختلاف ہو جائے تو اس کا تصفیہ خود حکومت اپنے ذمہ لے گی وہ اس انتظار میں نہیں رہے گی کہ فریقین میں سے کوئی اس سے درخواست کرے تو وہ ثالث بالخیر بنے۔

باب سوم
اُجرت کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نظر سے

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ موجودہ مادی دور میں جن اقتصادی سیاسی اور معاشرتی مسائل کا کوئی معتدل اور متوازن حل اب تک دنیا تلاش نہیں کر سکی ہے، ان میں ایک مسئلہ مزدوروں کی اجرت کا بھی ہے۔

اوپر یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ اس وقت پوری دنیا دو نظاموں میں بٹی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا حصہ "سرمایہ دارانہ جمہوریت" کا حامی ہے اور "دوسرا" "کمیونزم یا سوشلزم" کا، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ایک حصہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا شکار رہے، اور دوسرا اس کے ردعمل کا تجربہ کر رہا ہے، مگر ان دونوں نظاموں میں مزدوروں کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا اگر ان پر سرمایہ دارانہ جمہوریت میں سرمایہ داروں کی اجارہ داری کی وجہ سے ظلم و تشدد ہوتا رہا ہے، تو کمیونزم کی مجبورانہ اسٹیٹ کنٹرول پالیسی میں اس سے کچھ زیادہ ظلم ہو رہا ہے، فرق صرف اتنا ہے، کہ جمہوری ملکوں میں انہیں احتجاج، مظاہرہ، اسٹرائک اور پیشہ کی تبدیلی کا حق اور آزادی حاصل ہے، اس لیے وہ ان ذرائع سے اپنے جذبات کی کچھ تسکین بھی کر لیتے ہیں، اور کچھ اپنے حقوق بھی منوا لیتے ہیں، مگر کمیونسٹ ملکوں میں انہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے، اس لئے وہ گھٹ گھٹ کر اپنی صلاحیتوں اور اپنے احساسات کا خون کرتے رہتے ہیں، اس لئے بسا اوقات بادی النظر میں کمیونسٹ ملکوں کے مزدوروں کی تکلیفوں کا پتہ لگانا بھی دشوار ہوتا ہے، مگر ادھر ادھر سے چھن چھن جو خبریں اخبارات

وغیرہ میں آجاتی ہیں ان سے ان کی بے چینی کا اندازہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل آچکی ہے،

پھر یہ نظام اس حیثیت سے بھی ناقص ہیں کہ وہ مزدوروں کی محض مادی ضرورتوں اور احتیاجوں کا تو کچھ نہ کچھ بندوبست کرتے ہیں، مگر وہ اجرت کے مسئلہ کو اس حیثیت سے نہیں دیکھتے کہ مزدور محض مادی ضرورتوں اور احتیاجوں ہی کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ وہ بھی ایک انسان ہے جس کے سینہ میں بھی دل ہے، اور عام انسانوں کی طرح اس کے دل میں بھی کچھ ایسے جذبات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں، جن کی وہ تسکین چاہتا ہے۔ معاشی ضرورتوں کے علاوہ اس کی کچھ معاشرتی، اخلاقی اور نفسیاتی ضرورتیں بھی ہیں جن کی وہ تکمیل چاہتا ہے، یہ محض اسلامی نظام اور اس کے قانون اجرت کی خصوصیت ہے کہ وہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل ہے، وہ ایک طرف اجیروں کی مادی ضرورتوں اور مشکلوں کا حل پیش کرتا ہے، تو دوسری طرف ان کے معاشرتی، اخلاقی اور نفسیاتی احساسات اور احتیاجات کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے، غرض یہ کہ اجرت کے سلسلہ کی ہر طرح کی مشکلوں اور دقتوں کا کوئی متوازن اور معتدل حل اگر کسی نظام میں موجود ہے، تو صرف اسلامی نظام میں ہے۔ اوپر اس سلسلہ میں کچھ اصولی باتیں عرض کی گئی ہیں، آئندہ صفحات میں ان کی مزید تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

محنت کی حیثیت اور عزت

مزدوروں کے مسائل کے سلسلہ میں سب سے بنیادی چیز محنت کی حیثیت کی تعیین ہے، جہاں تک محنت کی عزت افزائی کا سوال ہے اس کو دنیا کے موجودہ ہر نظام نے اہمیت دی ہے، مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ محنت کی یہ عزت افزائی انسان کو محض معاشی ضروریات کا مجموعہ سمجھ کر کی گئی ہے، اس لیے محنت

کش طبقہ کو اس سے ذہنی آسودگی حاصل نہیں ہو سکتی، ہم یہاں سب سے پہلے محنت کی حیثیت اور اس کی عزت افزائی کے سلسلہ میں اسلام کی ہدایات کی تفصیل بیان کرتے ہیں،

اسلام اور محنت کی عزت افزائی

انسان اپنی روزی کمانے کے لیے جو اور جیسی بھی محنت کرے خواہ وہ محنت جسمانی ہو، یا دماغی، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے، اور اجازت ہی نہیں دیتا ہے بلکہ محنت کرنے پر ابھارتا ہے، اور جو لوگ اپنا پسینہ بہا کر اپنی روٹی حاصل کرتے ہیں، ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے، جو بغیر محنت کے دوسروں کے سہارے اپنا پیٹ پالتے ہیں، خصوصیت سے جسمانی اور معمولی محنت کے کام کرنے والوں کو جنہیں آج کی مہذب دنیا میں بھی معاشرہ میں وہ بلند مقام حاصل نہیں ہے، جو دوسرے طبقوں کو حاصل ہے، اسلام ان کو وہی مقام عطا کرتا ہے، جو مملکت کی بڑی سے بڑی شخصیت کو حاصل ہوتا ہے، اور یہ حق ان کو محض نظری اور قانونی طور پر نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسلام کے اصلی نمائندوں نے اپنے عمل اور اپنی سیرت سے اس کا ثبوت دیا ہے، انبیاء کرام جو اپنے اخلاق و کردار اور عزت و شرافت کے اعتبار سے پوری انسانیت کا جوہر ہیں انھوں نے خود محنت اور مزدوری کی ہے، اور اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کمائی ہے، دوسروں کی بکریاں چرا کر اور گلہ بانی کر کے اپنی قوت لایموت کا سامان کیا ہے، آج انبیاء کرام کے ماننے والے پیشہ اور محنت اور مزدوری کو ذلیل چیز شمار کرتے ہیں، مگر ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں یہ واقعہ بھی ملتا ہو کہ وہ مزدوری کرنے والوں کے ہاتھ کے گھٹے کو خوش ہو کر بوسہ دیتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ اسلام نے محنت کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا، وہ پیشہ، محنت اور مزدوری میں آزادی کا قائل ہے، مگر اس کے

ساتھ ایسی محنتوں پر وہ پابندی بھی لگاتا ہے، جو معاشی یا اخلاقی حیثیت سے معاشرہ کے لیے مضر ہوں، اس کی وجہ یہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، اسلام انسان کو پائیدار اور مستقل اخلاقی قدریں دیتا ہے، اور ان قدروں کی پامالی وہ کسی حالت میں پسند نہیں کرتا، چونکہ وہ معاش کو بھی ان قدروں کا پابند بنانا چاہتا ہے، اس لیے وہ نہ تو مغرب کی بے قید معیشت اور محنت کی اس بے قید تعریف کو تسلیم کرتا ہے کہ جس کام سے آدمی کو مادی یا غیر مادی معاوضہ حاصل ہو وہ محنت اس کے لیے بارآور ہے اور نہ اشتراکیت کی بے اخلاقی جبری محنت کو پسند کرتا ہے، بلکہ اسلام صرف اس محنت کو بارآور محنت کہتا ہے جو اجرت و منفعت کے اعتبار سے تو آزاد ہو مگر اس کی آزادی اخلاقی حدود کے اندر ہو۔

قرآن پاک میں مزدوروں کی حیثیت ان کی محنت کی حد اور اجرت کی تعیین اور ان کے ساتھ مالک کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے اس کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، خصوصیت سے سورہ بقرہ اور قصص میں، اجرت کی تعیین کے بیان میں، اس کی پوری تفصیل آئے گی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

محنت کی عزت افزائی کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یہاں ملاحظہ ہوں۔

ما اکل احد طعاما قط خیرا من ان یاکل من عمل یدیہ وان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدیہ [۱]

اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے، جو آدمی اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتا ہے

---

[۱] مسٹر ٹاسگ ج ۱ ص ۲۳ [۲] مشکوٰۃ: ۲۴۱ طبع سعید کمپنی کراچی

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کماتے تھے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی مزدوری کا قرآن پاک میں جو ذکر ہے، اس کا ذکر کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

أجر نفسه ثمان سنين أو عشرا على عفة فرجه و طعامه۔[1]

انھوں نے آٹھ یا دس برس تک اس طرح مزدوری کی کہ اس پوری مدت میں وہ پاک دامن بھی رہے اور اپنی مزدوری کو بھی پاک رکھا۔

یہ حدیث قرآن مجید کے و لفظ القوی الامین کی گویا تفسیر ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مزدور میں اخلاقی اوصاف کیا ہونے چاہئیں، اس کی تفصیل آگے آئے گی، آپ نے ان چند انبیاء کرام ہی کا اسوہ پیش نہیں کیا، بلکہ ایک حدیث میں فرمایا

ما بعث الله نبيا الا رعى الغنم[2]

خدا نے جتنے انبیا بھیجے ہیں ان سب نے بکریاں چرائی ہیں۔

صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ، آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں، فرمایا۔

نعم كنت ارعى على قراريط لاهل مكة[3]

ہاں میں بھی چند قیراطوں کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔

ایک صحابی نے آپ سے پوچھا کہ

اى العمل اطيب قال عمل الرجل بيده[4]

کون سی کمائی سب سے زیادہ پاکیزہ ہے، آپ نے فرمایا۔ اپنی محنت کی کمائی۔

حدیث میں ہے کہ ایک انصاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دست سوال دراز کیا، آپ نے ان سے پوچھا تمہارے پاس کوئی سامان ہے فرمایا ایک کمبل، اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے، فرمایا اسے لے آؤ۔ وہ

---

[1] مشکوٰۃ: ۲۵۲ طبع کراچی [2] مشکوٰۃ: ۲۵۸ باب الاجارہ [3] ایضاً باب الاجارہ [4] مشکوٰۃ: ۲۴۲

لے آئے آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ اس کو کون خرید تا ہے، ایک صحابی نے اس کی قیمت ایک درہم لگائی، آپ نے فرمایا اس سے زیادہ کوئی قیمت دے سکتا ہے؟ ایک دوسرے صحابی دو درہم قیمت دینے پر تیار ہو گئے، آپ نے یہ چیزیں ان کے حوالہ کیں اور دو درہم ان سے لے کر انصاری کو دے دئے کہ ایک درہم کی کلہاڑی لے کر آؤ، اور ایک درہم کا غلہ خرید کر گھر میں رکھ دو، انہوں نے اس کی تعمیل کی، جب وہ کلہاڑی لے کر آئے، اور ایک درہم کا غلہ خرید کر گھر میں رکھ دیا، تو حضورؐ نے اپنے دست مبارک سے اس کلہاڑی میں بلینٹ لگائی، اور ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ جاؤ اس سے لکڑی کاٹ کاٹ کر بیچو، پندرہ دن تک تم میرے پاس نہ آنا، پندرہ دن کے بعد جب وہ حاضر خدمت ہوئے، تو پوچھا کیا حال ہے، عرض کیا اس سے میں نے دس درہم کمائے ہیں، جن میں سے چند درہم کے کپڑے خریدے ہیں، اور چند درہم سے غلہ وغیرہ خریدا ہے، آپ نے فرمایا کیا بھیک مانگ کر قیامت کے دن ذلت اٹھانے سے یہ بہتر نہیں ہے[1]۔

پھاوڑا چلاتے چلاتے ایک صحابی کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو پوچھا، تمہارے ہاتھوں پر کچھ لکھا ہوا ہے، بولے نہیں، پتھر پر پھاوڑا چلاتا ہوں اور اس سے اپنے اہل وعیال کی روزی کماتا ہوں، آپ نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

پیشہ کی حقارت کو مٹانے کے لیے آپ خود اس کا عملی نمونہ پیش فرماتے تھے، ایک بار کوئی رخصت کا کام کیا، اور مسلمانوں کو بھی اس کی ترغیب دی لیکن مسلمان اس سے الگ رہے، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کے لیے

---

[1] مشکوٰۃ: ۱۶۳ طبع سعید کمپنی کراچی۔

مخصوص خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسے کام سے الگ رہتے ہیں جس کو میں خود کرتا ہوں، خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا کا خوف رکھتا ہوں[1]،،

اس واقعہ میں مسلمانوں کے لیے سبق ہے جو اپنے ہاتھ سے کام کرنا عزت کے خلاف سمجھتے ہیں، فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ایک تو انا تندرست نوجوان یہ کہتا ہوا مسجد نبوی میں داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے، حضرت فاروق نے اس کو اپنے پاس بلایا، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اپنی زمین میں کام لینے کے لیے اس شخص کو کون مزدوری پر رکھتا ہے، ایک انصاریؓ بولے، میں یا امیر المومنین۔ آپ نے پوچھا تم اس کو ماہانہ کتنی اجرت دو گے، انہوں نے اجرت بتائی فرمایا اس کو لے جاؤ اور کام لو۔

چند مہینے بعد حضرت عمر نے انصاری سے پوچھا کہ مزدور کا کیا حال ہے، انہوں نے کہا ٹھیک ہے، آپ نے حکم دیا کہ اسے جمع شدہ اجرت کے ساتھ میرے پاس لاؤ چنانچہ وہ مزدور درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی کے ساتھ آپ کے سامنے لایا گیا، آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ لو یہ تھیلی، اب جی چاہے جہاد کرو یا جی چاہے گھر بیٹھو[2]

اسلام نے جو ذہنیت پیدا کی تھی، اس کی وجہ سے اس زمانہ میں کوئی شخص بھی بے کار رہنا پسند نہیں کرتا تھا، چنانچہ صحابہ میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو کوئی نہ کوئی پیشہ نہ کرتے ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں یہ عام جذبہ پیدا کر دیا تھا، کہ وہ کسی پر اپنا معاشی بار ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب صحابہ کی ایک جماعت مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئی، تو انصار نے آنحضرت صلی

---

[1] معاشی نظریے ج ۱ ص ۲۱۴ [2] کنز العمال ج ۲ ص ۲۱۷۔

اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی، کہ آپ ان کی جائداد کو ان کے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرمادیں، آپ نے فرمایا کہ نہیں مہاجرین سے تم یہ کہو کہ:

تکفونا المؤنۃ ونشرککم فی الثمرۃ قالوا سمعنا واطعنا ۱؎

تم محنت میں ہمارا تعاون کرو ہم پیداوار میں تم کو شریک کریں گے انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ منظور ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، کہ جب میں کسی تندرست آدمی کو دیکھتا ہوں تو دریافت کرتا ہوں کہ وہ کوئی پیشہ کرتا ہے یا نہیں، اگر وہ کہتا ہے کہ میں بے کار ہوں، تو میری نظر سے گر جاتا ہے، آپ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے تھے کہ:

لا تکونوا عیا لا علی المسلمین ۲؎

مسلمانوں پر بار نہ بنو۔

حضرت عمرؓ جب کسی آدمی کو بے کار دیکھتے تو یہ کہہ کر درہ لگاتے کہ۔

انی لاکرہ ان اری احدکم منتھلا لا فی عمل الدنیا ولا فی عمل الاٰخرۃ۔

میں کسی کو بے کار دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ نہ وہ دنیا کا کام کرے اور نہ آخرت کا۔

مگر اسی کے ساتھ اسلام انسان پر یہ پابندی عائد کرتا ہے، کہ وہ کسی ایسے پیشہ یا کام سے روزی نہ کمائے جو جسمانی صحت یا اخلاقی اعتبار سے معاشرہ کے لیے مضر ہو، اسلام نے اس کے لیے حلال وحرام کی حد بندی ہے، جو معاش کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، خواہ تجارت ہو یا زراعت، صنعت ہو یا اجرت ومحنت، اس کا لحاظ

۱؎ بخاری ج ۱ ص ۳۱۲ مطبوعہ کرزن پریس دہلی ۲؎ معاشی نظریے ص ۲۵۹

کرنا ضروری ہے، قرآن مجید نے کسب معاش کے ان تمام ذرائع اور طریقوں کو جو حلال و حرام کی تمیز کے بغیر اختیار کیے جاتے ہیں، ناجائز اور اکل باطل قرار دیا ہے، اور ان کی نشان دہی بھی کر دی ہے، اور اس کی پوری تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ملتی ہے۔ ہم ان ارشادات کو یہاں نقل کرتے ہیں، جو محنت و اجرت سے متعلق ہیں۔

آپ نے فرمایا "حلال کی کمائی اسلام کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے" چنانچہ اسلام مسلمانوں کو شراب کی تجارت سے روکتا ہے، اس میں جو لوگ اجرت پر کام کرتے ہیں، ان کو اس سے روکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ۔

> شراب کا پینا، پلانا، بیچنا، خریدنا، اس کی باربرداری کرنا سب حرام ہے۔

یعنی کوئی شخص شراب کا کاروبار ہی نہیں بلکہ اس میں اجرت اور محنت پر کام کرتا ہے تو بھی اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے مجرم ہے، اسی طرح سودی کاروبار سٹے بازی اور وہ تمام تفریحی کاروبار جن سے بداخلاقی پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے مثلاً عریاں تھیٹر، سینما وغیرہ کی اجازت نہیں دیتا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان ذرائع سے روپیہ کما کر اس سے زکوٰۃ و خیرات بھی کرے، تو خدا کے یہاں وہ مقبول نہ ہوگی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ اگر کوئی حرام ذریعہ سے پیسہ پیدا کرے اور صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول نہیں ہوگا۔

اسی طرح ان محنتوں کو بھی وہ بار آور قرار نہیں دیتا، جن سے توہم پرستی شک

لہ معاشی نظریے ص ۲۵۹

پسندی یا اس سے کسی انسان کے بارے میں خدائی کا کوئی تصور پیدا ہو، مثلاً کہانت، رمل، غیب دانی، گنڈے، تعویذ اور قبروں کی مجاوری کو بطور پیشہ اختیار کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔

مزدوروں پر ظلم موجودہ دور میں مزدوروں کی حق تلفی، ان پر ظلم و زیادتی کی جو عام شکایت ہے، اس کا سلسلہ بہت قدیم ہے، اگر اسلام سے قبل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو محنت کش طبقہ اور مزدوروں کی حالت جانوروں سے بدتر نظر آئے گی، بعثت نبوی سے پہلے دنیا میں بڑے بڑے انسانیت دوست مذاہب موجود تھے، اور بڑی بڑی متمدن سلطنتیں بھی تھیں، مگر اس طبقہ کو کسی نے اس کا حق دلانے کی کوشش نہیں کی، ہندو مت میں محنت کش طبقہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے اس کا مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے اس نے پیشہ ور اور محنت کش طبقہ کو ہزاروں برس سے سماج میں جو ذلیل مقام دے رکھا ہے، وہ سب کو معلوم ہے اور ہندوؤں کی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے جس میں اس کا ذکر نہ ہو، چنانچہ منوسمرتی میں بھی بعض پیشوں کا ذکر ہے، جن کو ناپاک قرار دیا گیا ہے، مثلاً بڑھئی، وید، درزی، سنار، لوہار، رنگریز، دھوبی اور معمار وغیرہ انکے ساتھ کھانے سے اتنی تکلیف ہوتی ہے، جتنی کہ بال اور ہڈی کے کھانے سے[1]۔

یہودیت و عیسائیت الہامی مذاہب ہیں، اس لیے ان میں انسان کے کسی طبقہ کے ساتھ ظلم و ستم اور ان کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی تعلیم نہ ہونی چاہیے تھی، مگر یہودیوں نے اپنی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے تحت محنت کش طبقہ کے بارے میں جو اصول اپنے مذہب میں داخل کر دیئے ہیں، وہ ایک الہامی مذہب کے لیے بدنما داغ بھی ہیں، اور عبرت خیز

---

[1] منوسمرتی، ادھیائے ۴، منتر ۲۱۳ ص ۱۵۴ بحوالہ معاشی نظریے ص ۱۱۴۔

بھی ہیں یہودی بائیبل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

اگر کوئی مالک اپنے خادم یا ملازم کو زدوکوب کرے، اور وہ فوراً مر جائے تو مالک کو سزا دی جائے گی، لیکن وہ بدقسمتی سے کچھ دن زندہ رہ گیا، تو پھر اس کو کوئی سزا نہ دی جائے گی، اس لیے کہ وہ ملازم اس کا مال ہے[1]

اگر آقا اپنے ملازم کی شادی کر دے، اور اس سے بچے پیدا ہوں تو وہ آقا کی ملک ہوں گے، اگر وہ مطالبہ کرے تو عدالت کا فرض ہے کہ اس کے کان میں سوا چھید کر اس کو دروازہ میں گھسا دے، کہ وہ اس طرح ہمیشہ اس کی خدمت کرے[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پوری زندگی "خدا کی بادشاہت" کی دعوت دیتے اور رحمت و شفقت اور مساوات کا وعظ کہتے رہے، مگر ان کی وفات کے بعد ان کے ماننے والوں اور سینٹ پال نے جو عیسائیت دنیا کے سامنے پیش کی، اس میں اس کی یہ تعلیم ہے۔

مزدور یا ملازم اس قابل نہیں کہ ان کا شکریہ ادا کیا جائے[3] اور خدائی بادشاہت کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ گھر بار، بیوی بچے، اور پیشہ کو چھوڑ دے، جو کوئی اپنا ہاتھ بیل پر رکھ کر پیچھے دیکھتا ہے وہ خدا کی بادشاہت کے لائق نہیں ہے[4]

یہ تو دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کی تعلیم تھی، اس زمانہ کی سیاسی دنیا میں اس طبقہ کی جو حالت تھی اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

بعثت نبوی کے وقت مصر میں رومیوں کی ایک متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت

---

[1] بائیبل ہجرت باب ۲۱، ۲۰-۲۱ [2] ایضاً [3] انجیل لوقا باب ۱۷ [4] انجیل لوقا باب ۱۶ ص ۵۹

تھی مگر وہاں اس طبقہ کی جو حالت تھی، اس کی تصویر مصر کے پہلے گورنر عمرو بن العاصؓ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے اور جو شہد کی مکھی کی طرح دوسروں کے لیے محنت کرتی ہے اور اپنی محنت اور اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی[1]

ایران اور روم میں بھی اس طبقہ کی حالت رومی مصر سے بہتر نہیں تھی، حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ مجھے ظلماً لوگوں نے غلام بنا لیا تھا، اور میں دس سے زیادہ مالکوں کے پاس دست بدست منتقل ہوتا رہا[2]

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:۔

یہی حال قدیم رومیوں کا تھا قدیم مصریوں کے یہاں پیشہ وروں کو خصوصاً گلہ بانوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا، اور وہ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے[3]

یونان جو تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے، اس کا نفس ناطقہ ارسطو کہتا تھا کہ وحشی یعنی غیر یونانی غلام بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

اس نے سکندر کو مشورہ دیا تھا کہ۔

وہ یونانیوں کا قائد اور وحشیوں یعنی غیر یونانیوں کا آقا کہلائے، اول الذکر کے ساتھ دوستوں اور رشتہ داروں کا اور ثانی الذکر کے ساتھ درندوں اور درختوں کا برتاؤ کرے[4]

---

[1] تمدن عرب مترجم سید علی بلگرامی: ص ۲۰۱ [2] بخاری: ۱: ص ۵۶۲ کرزن پریس دہلی۔

[3] ٹوئن بی اکنامک لائف آف دی اینشنٹ ورلڈ باب ۴ ۸

[4] معاشی نظریے ج ۱: ص ۱۳۰۔

جزیرہ عرب میں اس وقت نہ تو کوئی سیاسی مرکزیت تھی، اور نہ تمدنی اعتبار سے وہاں کے باشندے کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے تاہم وہاں کے بھی اس طبقہ کے زبوں حالی کے دو چار واقعے سن لیجئے، تاکہ اس کا اندازہ ہو سکے کہ اسلام نے اس طبقہ پر کیا احسانات کیے ہیں، اور اس کو زندگی کی پستی سے نکال کر بلندی کے کس درجہ تک پہنچایا ہے۔

بعثت نبوی سے پہلے ساری دنیا میں اور خاص طور سے عرب میں غلامی کی رسم جاری تھی، صرف وہی لوگ غلام نہیں بنائے جاتے تھے، جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آتے تھے، بلکہ جو بھی بے وسیلہ اور بے سہارا آدمی مل جاتا تھا، اسے اپنی ملک بنا لیتے، اس پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا تھا، حضرت سلمان فارسیؓ کا بیان اوپر گذر چکا ہے کہ وہ اسی طرح دس آدمیوں کی غلامی میں رہے، حدیثوں میں اس طرح کے اور واقعات بھی ملتے ہیں، مثلاً یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

ایک ہاشمی کو قریش کے کسی شخص نے اجرت پر رکھا، وہ دونوں کہیں جا رہے تھے، اتفاق سے ایک اور ہاشمی کا ادھر سے گذر ہوا، اس نے اونٹ باندھنے کے لیے ڈوری مانگی، دوسرے نے دے دی، اور منزل پر تمام اونٹ تو باندھ دیئے گئے، مگر ایک اونٹ کھلا رہ گیا، آجر نے پوچھا ایک اونٹ کیوں کھلا ہے، مزدور نے کہا کہ اس کی ڈوری نہیں ہے، اس پر وہ قریشی اس پر سخت برہم ہوا اور مزدور کو اس قدر مارا کہ مر گیا، جب وہ مکہ واپس پہنچا، اور لوگوں نے مزدور کا حال دریافت کیا، اس نے موت کی اطلاع دی۔"

یہ خاندان بنو ہاشم کا مزدور تھا، جو مکہ میں سب سے ممتاز تھا، جس کو ایک رسی کے لیے قتل کر دیا گیا، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بے سہارا اور بے وسیلہ مزدوروں اور غلاموں کی کیا قدر و قیمت رہی ہو گی۔

باب چہارم

غلاموں اور مزدوروں پر اسلام کا احسان

بعثت نبوی سے پہلے اور اس ترقی یافتہ دور میں مزدوروں اور محنت پیشہ طبقہ کی حالت کا جو نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اس طبقہ کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے وہ سب اسلام ہی کا فیض ہے۔

اوپر محنت، مزدوری اور اس طبقہ کی عزت افزائی کا ذکر کیا جا چکا ہے، اب سیرت نبوی اور اسوۂ صحابہ کے چند واقعات اور درج کئے جاتے ہیں جس سے اس کی مزید تفصیل معلوم ہوگی۔

حضرت موسیٰؑ کو حضرت شعیب نے جب بکریاں چرانے کیلئے اجرت پر رکھا تو اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا "میں تم پر کوئی سختی نہیں کروں گا"

حضرت موسیٰ نے بھی جواب میں کہا "مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیئے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجیر کے ساتھ ظلم و زیادتی ایک قدیم روایت ہے جسے کسی آسمانی مذہب اور نبی نے پسند نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ اپنے اسوہ سے اس کو مٹایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اجیروں، اپنے خادموں اور ملازموں کے ساتھ جو مساویانہ سلوک کرتے تھے اس کی مثال دنیا کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی زندگی میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف تو مزدور طبقہ کو ناپاک اور ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں"۔ ایک حدیث میں ہے:۔

أخوانكم خولكم جعلهم الله تحت أيديكم فمن جعله الله أخاه تحت يده فليطعمه مما يأكل وليلبسه مما يلبس ولا يكلفه من العمل ما يغلبه فان كلفه فليعينه [1]

ملازم اور مزدور تمہارے بھائی ہی ہیں۔ خدا نے انہیں تمہارا ماتحت بنایا ہے۔ تو خدا نے جس کے تحت ان کے کسی بھائی کو کیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ خود جو کھائے وہی اس کو کھلائے اور خود جو پہنے وہی اس کو پہنائے اور اس سے ایسا سخت کام نہ لے جو اس کو نڈھال کر دے، اگر سخت کام لینا ہو تو خود بھی اس میں شریک ہو کر اس کی مدد کرے۔

آپ نے محنت کش طبقہ اور مزدوروں کے بارے میں فرمایا:

اکرموهم ککرامة اولادکم واطعموهم مما تاکلون۔ [2]

ان کی عزت افزائی کرو جتنی اپنی اولاد کی کرتے ہو اور ان کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ۔

لا یدخل الجنة سیئ الملکة۔

اپنے ماتحتوں سے بدخلقی اور بدمعاملگی کرنے والے جنت میں داخل نہیں ہونگے،

---

[1] بخاری: ج ۱: ص ۹ مطبوعہ کرزن پریس دہلی [2] اس حدیث کا ایک ایک لفظ قابل غور ہے ان کی عزت افزائی کا مطلب یہ ہے کہ محض ان کو معاشی حیوان نہ سمجھو کہ ان کے سینہ میں بھی دل ہے اور ان کے بھی کچھ معاشرتی اور نفسیاتی جذبات اور احساسات ہیں ان سب کی رعایت اسی طرح کرو جس طرح اپنی اولاد کی کرتے ہو۔ اسی طرح وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو سے مراد یہ ہے کہ ان کی ساری معاشی ضروریات کے پورا کرنے میں جذبہ مساوات کو ملحوظ رکھو

آخرت میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوں گے۔ ان میں ایک وہ شخص بھی ہے۔

رجل استاجر اجیرا فاستوفی منه ولم یعطه اجره [1]

جس نے کسی مزدور کو مزدوری پر رکھا پھر اس سے پورا پورا کام لیا اور اس کی مزدوری مار بیٹھا۔

مزدوری مار بیٹھنے میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے استحقاق یا اس کی ضروریات سے کم مزدوری دی جائے۔ آگے اس کی مزید تفصیل آئے گی آپ نے ادائیگی اجرت کے بارے میں فرمایا کہ۔

اعطوا الاجیر اجره قبل ان یجف عرقه [2]

مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر ملازم غلطی کرے تو کتنی بار معاف کیا جائے۔ آپ خاموش رہے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا، آپ نے کوئی جواب نہیں دیا پھر تیسری بار پوچھا تو فرمایا۔ کل یوم سبعین مرۃ ہر دن اگر ستر مرتبہ بھی غلطی کرے تو معاف کرو۔

خود انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس تعلیم کا عملی نمونہ تھی۔ آپ نے اپنے ذاتی ملازموں خادموں اور مزدوروں سے کبھی نابرابری کا سلوک نہیں کیا۔ اور نہ ہی غلطی پر سزا دی۔

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ میں دس برس تک آپ کی خدمت میں رہا مگر آپ نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ یہ کام ایسے کیوں کیا یا یہ کام کیوں نہیں کیا۔

اسلامی تعلیم کا اثر

اسلام کی اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ عرب کے وہ لوگ جو جاہلیت میں غلاموں ملازموں اور مزدوروں کے ساتھ چوپایوں جیسا سلوک کرتے تھے، انہوں نے ان کو اپنا بھائی بنا کر گلے سے لگا لیا۔ جو خود کھایا وہ ان کو کھلایا جو خود پہنا وہ ان کو پہنایا اور جو اپنے لئے پسند کیا ان کیلئے پسند کیا۔ اس کے کچھ واقعات

---

[1] مشکوٰۃ: ۲۵۸ طبع کراچی [2] ایضاً

ملاحظہ ہوں۔ عہد نبوی اور اس کے بعد ایک مدت تک خدمت اور مزدوری وغیرہ کا کام زیادہ تر غلاموں اور ذاتی ملازموں سے ہی لیا جاتا تھا، اس لئے یہ واقعات زیادہ تر انہی سے متعلق ہیں۔ مگر موجودہ دور میں وہ حیثیت کارخانہ دار اور کارخانہ میں کام کرنے والے مزدوروں کو حاصل ہو گئی ہے۔ اس لئے ان کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ پہلے ایک آدمی دو چار مزدوروں سے کام لیتا تھا تو آج ہزار دو ہزار سے کام لینے لگا ہے اس لئے وہ سارے احکام موجودہ دور کے مزدوروں کے لئے جوں کے توں باقی ہیں۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاری ایک عمدہ چادر اوڑھے ہوئے تھے اور اپنے غلام کو بھی ایسی ہی چادر اڑھائی تھی۔ لوگوں نے دیکھا تو کہا کہ آپ غلام کو دوسرا کپڑا پہنا کر اس سے چادر لے لیجئے تو آپ کا جوڑا پورا ہو جائے۔ بولے میں نے ایک بار اپنے غلام کو برا بھلا کہا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ ابوذر ابھی تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے (فیک جاہلیۃ) یہ لوگ تمہارے بھائی ہیں[1]۔ اس لئے میں نے ایسا کیا ہے۔

ایک بار حضرت علیؓ نے دو قمیصیں خریدیں۔ ان کا غلام بھی ساتھ تھا اس سے فرمایا ان میں جو تمہیں پسند ہو لے لو، اس نے ایک قمیص لے لی۔

حضرت عثمانؓ رات کو اٹھ کر خود وضو کرتے تھے۔ لوگوں نے کہا آپ کسی خادم سے کہہ دیتے جو آپ کو وضو کرا دیا کرتا۔ بولے نہیں، رات ان کے آرام کیلئے ہے[2]۔

ایک بار ایک صحابی کے بیٹے نے غلام کو طمانچہ مارا۔ باپ نے دونوں کو بلایا اور

---

[1] بخاری: ۱:۹: مطبوعہ دہلی۔
[2] اسد الغابہ تذکرہ حضرت عثمانؓ۔

غلام سے کہا کہ اس کا بدلہ لو۔[1] سوید بن مقرن کہتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے اور ایک ہی خادم تھا۔ کسی نے اسے مار دیا تو حضور نے آزاد کرنے کا حکم دیا[2]

ایک بار حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کو سبق دینے کیلئے بہت سے غریبوں و بیچاروں کو بلایا، اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو جو ان کے ساتھ کھانے میں عار محسوس کرتے ہیں[3]

کیا کوئی مذہب یا موجودہ دور کا کوئی مادی نظام اجیروں کے ساتھ مساوات کا یہ نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ غالباً اسلامی تعلیم کی خوبی کو دیکھ کر مسٹر رچرڈسن نے قانون ازالہ غلامی کو انڈیا کونسل میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

> غلامی کی مکروہ رسم کو مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ ہندو شاستر کو قرآن سے بدل دیا جائے[4]

اس وقت اشتراکیت کی مساوات کا دنیا میں بڑا چرچہ ہے اور سیدھے سادھے مسلمان ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے متاثر ہو گئے ہیں مگر اس کی مساوات کا حال یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں صدر جمہوریہ روس نے قازان کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے سے فارغ ہو کر انہوں نے کسان قائدین کے مجمع میں اس دورے کے تاثرات بیان کئے۔ اس میں کہا کہ قازان کے ایک مقام پر کسانوں کے سامنے میں تقریر کر رہا تھا کہ یکایک ایک عورت آئی اور چلا کر کہنے لگی تمہارے جوتے تو اتنے اچھے ہیں، مجھے ایسے جوتے کب ملیں گے۔ میں نے اس کو جواب دیا کیا تم چاہتی ہو کہ صدر جمہوریہ چپلوں میں ٹاپتا پھرے۔ آس پاس کے لوگوں نے بھی میری تائید کی کہ یہ عورت احمق ہے۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ تم چپلیں پہنو تو کوئی محسوس نہیں کرے گا لیکن میں پہنوں تو ہر شخص کی نظر پڑے گی[5]

---

[1] ابو داؤد : کتاب الادب [2] الادب المفرد حدیث ۱۷۶ [3] ایضاً ص ۲۰ [4] معاشی نظریے جلد ا
[5] الہدیٰ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۴۸ء بحوالہ لندن ٹائمز

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی، کہ اسلام نے ہر قسم کی محنت کی ہمت افزائی کی ہے، اور اس نے محنت کو ذلیل یا گری پڑی چیز یا محنت کرنے والوں کو کم تر اور ذلیل نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس نے اپنے پسینہ کی کمائی کو سب سے بہتر روزی قرار دیا ہے، وہ دوسرے مذاہب اور موجودہ مادی نظامہائے حیات کی طرح محنت کش طبقہ کو معاشرہ میں کوئی الگ عنصر اور ایک خاص طبقہ قرار نہیں دیتا ہے بلکہ اخلاقی اور قانونی دونوں حیثیتوں سے اس کو وہی مقام دیتا ہے جو دوسرے طبقوں کو حاصل ہے وہ پیشہ کے اختلاف یا مزدور و سرمایہ دار کی حیثیت سے کسی امتیاز کو روا نہیں رکھتا اس کے یہاں امتیاز کا معیار صرف خدا کا خوف اور احساس ذمہ داری ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں طبقہ واری کش مکش کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اوپر کے بیانات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہاں بندہ و آقا میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ان کو (اخوانکم) بھائی بنایا تھا اسی طرح اسلامی معاشرہ میں ان کے ساتھ بھائیوں کا سلوک روا رکھا گیا۔

آج بھی صحیح اسلامی معاشرہ میں آپ اس تفریق کا وجود نہیں پائیں گے اور اگر اس زمانہ میں کوئی صحیح اسلامی حکومت قائم ہوگی تو اس کا اولین فرض ہوگا کہ وہ اس امتیاز کو مٹا دے۔ اس دور کے مغربی معاشین نے بھی لکھا ہے، جیسا کہ مسٹر ٹاسگ کا قول اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ بغیر اس امتیاز کو مٹائے ہوئے مزدوروں کے مسئلہ کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔

مزدوروں کے قانونی حقوق کی تفصیل آگے آ رہی ہے مگر جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ مزدوروں کے معاشی اور مادی حقوق کے ساتھ ان کے کچھ معاشرتی حقوق اور نفسیاتی احساسات اور جذبات بھی ہوتے ہیں ان حقوق اور جذبات کی رعایت دوسرے

نظاموں میں موجود نہیں ہے یہ صرف اسلامی نظام ہی ایسا نظام ہے جس میں اس کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اوپر محنت کی عزت افزائی کے سلسلہ میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں ان سے اس کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ آئندہ صفحات میں بھی ان کی اس حیثیت پر جا بجا بحث ہوگی۔

اجیروں کے قانونی حقوق

عام انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اخلاق اور روحانیت کے کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائیں ان میں مادی جذبات بہرحال موجود ہوں گے کیونکہ انسانی جبلت محض اخلاق کی قوت سے قابو میں نہیں آتی۔ اور اس کے لئے کچھ قانون کی پابندیاں لگانا پڑتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے اس کی اس فطرت کے پیش نظر اخلاق و قانون دونوں کے ذریعہ محنت کش طبقہ کی مدد کی ہے۔

مسٹر ٹاسگ مسائل محنت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں کہ۔

محنت کے متعلق جو ضخیم مجموعہ قوانین و ضوابط مرتب ہوا ہے اس کی بڑی قوت محرکہ انسانی ہمدردی کا وہ عام جذبہ رہا ہے جو گذشتہ ڈیڑھ صدی میں تمام مہذب دنیا میں موجزن ہوا[1]

مسٹر ٹاسگ چونکہ اسلامی قانون اجرت سے واقف نہیں ہیں اس لئے انہوں نے ایسا لکھا ہے اگر وہ اس کے جذبہ ہمدردی اور مساویانہ طرز عمل سے واقف ہوتے تو اس کی مدت وہ ڈیڑھ صدی کے بجائے ڈیڑھ ہزار قبل قرار دیتے۔

مسٹر ٹاسگ میں انسانی ہمدردی کا جذبہ ضرور موجود ہے، اس لئے جب وہ معاشی مسائل کی مشکلات میں پھنستے ہیں تو اس جذبہ کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس

---

[1] باب اوقات کار: ج ۱: ص ۴۵۲۔

جذبہ میں ایمانی ہدایت شامل نہیں ہے اس لئے اس کا کوئی واضح نقشہ ان کے سامنے نہیں آتا اور وہ بس اپیل کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔

اوپر اس طبقہ کے اخلاقی اور معاشرتی حقوق اور معاشرہ میں اس کے مقام کا ذکر آچکا ہے، اب اس طبقہ کے قانونی اور معاشی حقوق کی تفصیل کی جاتی ہے۔

اُجرت کا معاملہ ایک معاہدہ ہے

اسلامی قانون اجرت میں متاجر، مالک اور مزدور کی حیثیت دو معاہدہ کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک خریدار دکان دار سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کرتا ہے، خریدار قیمت دیتا ہے اور دکان دار مال ان میں سے کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک اجیر متاجر سے اُجرت کا معاملہ کرتا ہے تو گویا دونوں آپس میں ایک معاہدہ کرتے ہیں۔ اجیر اپنی محنت پیش کرتا ہے اور اس کے بدلہ میں متاجر محنت کی مزدوری دیتا ہے۔ اس میں کسی کی طرف سے ممنونیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے حضرت شعیبؑ سے یوں چرائی کا معاملہ کیا تو گویا حضرت شعیبؑ نے یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں تم پر کوئی زیادتی کروں مگر پھر بھی حضرت موسیٰ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ "میرے اور آپ کے درمیان یہ معاہدہ ہے ان دونوں میں سے جس مدت کو میں پورا کر دوں مجھ پر زیادتی نہ کی جائے۔"

حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دونوں نے زیادتی نہ کرنے کا ذکر اس لیے کیا کہ زیادتی عموماً آجر ہی کی طرف سے ہوتی ہے اس لیے حضرت شعیب نے بحیثیت آجر کے یہ بتا دیا کہ ظلم و زیادتی کرنا میرا منصب نہیں۔ مجھے انشاء اللہ بھلا آدمی پاؤ گے حضرت موسیٰ نے بحیثیت اجیر یہ وضاحت کر دی کہ میں محض معاہدہ کا پابند ہوں۔ اس کے علاوہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں۔ مقصد یہ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے، اس کی پابندی دونوں پر لازم ہے۔

صاحب بدائع الصنائع اس آیت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وقص اللہ علینا من شرائع من قبلنا من غیر نسخ یصیر شریعۃ لنا۔[1]

اگلی شریعتوں کے جو واقعات اللہ تعالیٰ نے نقل کیے ہیں اور اس کو منسوخ قرار نہیں دیا ہے تو ان کا اتباع ہمارے اوپر بھی فرض ہے اور وہ ہمارے لئے بھی شرعی احکام ہیں۔

ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

احتج الائمۃ الاربعۃ بشرع من قبلنا ان صح ذٰلک[2]

الائمہ اربعہ نے اگلی شریعت کے احکام سے استدلال کیا ہے بشرطیکہ وہ صحیح طریقہ سے ثابت ہوجائیں

یعنی یہ اسلامی قانون کی ایک دفعہ ہے کہ اجیر و مستاجر دونوں کی حیثیت مساوی ہے مستاجر کام لینے میں نہ تو زیادتی کرسکتا ہے اور نہ مزدوری کے طے کرنے میں۔ اسی طرح اجیر یا مزدور نہ کام میں بددیانتی کرسکتا ہے اور نہ بلاوجہ مالک کو پریشان کرسکتا ہے اس دفعہ کے تحت اسلامی حکومت ایسے قوانین وضع کرسکتی ہے جن کے ذریعہ فریقین میں سے کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جب کسی سے اجرت اور مزدوری پر کام لیتے تھے تو اس کو اپنا ممنون احسان اور نیاز مند بنانے کی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کو بالکل ایک معاہدہ کرنے والے کی حیثیت دیتے تھے۔ جیسا کہ اوپر کے واقعات سے ظاہر ہوچکا ہے۔

آپ کا وہ ارشاد گرامی بھی گذرچکا ہے جس میں آپ نے ان کو اپنا بھائی هم اخوانكم

---

[1] الکاسانی: بدائع الصنائع: جلد ۵، ص ۱۷۴ ۔ [2] ابن قیمؒ: الطرق الحکمیہ: ص ۲۵۶۔

قرار دیا ہے کتاب و سنت کی اسی تعلیم کی بنا پر تمام ائمہ فقہ و حدیث متفقہ طور پر اجیر کی یہ حیثیت تسلیم کرتے ہیں۔ اور اجارہ کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

الاجارۃ عقد علی المنافع بعوض۔

اجارہ ایک معاہدہ ہے جو کسی معاوضہ کے بدلہ کسی منفعت پر کیا جائے۔

تمام ائمہ نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ۔

ان العقد فی الاجارۃ تتعلق بالمنفعۃ دون الرقبۃ [۱]

مزدوری کے معاہدہ کا تعلق فائدے اور کام سے ہے مزدوروں کی ذات سے نہیں ہے۔

یعنی آجر اور مستاجر مزدوروں سے اس معاہدہ کی پابندی تو کرا سکتے ہیں جو ان سے کیا گیا ہے مگر ان کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان مزدوروں کو انہوں نے خرید لیا ہے یا وہ ان کے بندۂ بے زر ہیں۔

معاہدۂ اجرت یہ وہ مسلمہ حق ہے جسے اسلام نے آج سے ۱۴ سو برس پہلے محنت کش طبقہ کو دیا تھا جس کے حصول کے لیئے موجودہ دور میں مزدوروں کی انجمنیں دوڑ دھوپ کر رہی ہیں مگر اب تک اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا مسٹر ٹاسگ لکھتے ہیں۔

ان کا مطالبہ ہے کہ اجرت ہمیشہ کے لیے آجر کی مرضی سے نہ طے ہونی چاہیئے بلکہ معاہدہ کے ذریعہ سے طے ہونی چاہیئے جس میں ان کے ذاتی عمل کا بھی مؤثر حصہ ہو [۲]۔

---

[۱] الافصاح ابن ہبیرہ: ص ۲۲۹ ۔ [۲] ٹاسگ: اصول معاشیات: باب ۵۷: جلد ۱، ص ۲۱۸

معاہدہ قرار دینے کے فائدے اور اسکی ذمہ داریاں

اجرت کے معاملہ کو معاہدہ قرار دینے میں کیا فائدے ہیں اور اس کی وجہ سے اجیر و مستاجر دونوں پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسکی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) اجرت کے معاملہ کو معاہدہ قرار دینے کا سب سے بڑا فائدہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے دونوں کو مساوی درجہ دینا ہے تاکہ معاشی اعتبار سے بھی ان کو وہی مرتبہ حاصل ہو جو ایک مستاجر کو حاصل ہوتا ہے۔

(۲) معاہدہ قرار دینے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ دونوں فریق معاملہ کرتے وقت ایک دوسرے کی ضرورت اور معاشی حالت کا پورا خیال رکھیں، صرف اپنی غرض میں باؤلے نہ ہو جائیں اگر ان میں سے کوئی فریق ایسا کرے گا تو حکومت مداخلت کرے گی چنانچہ قرآن میں اجرت کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط لگی ہوئی ہے وہ یہ کہ اجرت بطور معروف دی جائے۔ معروف کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو وہ اجرت ایسی زیادہ ہو کہ اجرت دینے والے کی قدرت سے باہر ہو اور نہ اتنی کم ہو کہ اجرت پانے والے کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا[1]

اور بچے والے پر قاعدہ اور دستور کے مطابق ان کا کھانا کپڑا ہے کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کیا جا سکتا۔

حدیث میں اجرت معروف کے ساتھ مزدوروں کے لئے اخوان (بھائی) اور اولاد کے الفاظ بھی منقول ہوئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مستاجر کو اجیروں کی اجرت دینے میں وہی جذبہ رکھنا چاہئے جو ایک بھائی اپنے بھائی کے ساتھ اور ایک باپ اولاد کے ساتھ رکھتا ہے اسی طرح اجیروں کو کام کرنے اور اجرت طلب کرنے

---

[1] البقرۃ: ۲۳۳

میں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو ایک بھائی دوسرے بھائی کے مقابلہ میں اختیار کرتا ہے۔ محض فائدہ اور خود غرضی ہی دونوں کو جمع کرنے اور جدا کرنے کا سبب نہ ہو

دودھ پلانے والی عورتوں کے سلسلہ میں قرآن میں جو لفظ معروف دارد ہوا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

کھانے اور کپڑے کی تعین آدمی کی حالت کے پیش نظر ہو گی اگر وہ خوش حال ہے تو اسی اعتبار سے اس کو دودھ پلانے والی کو کھانا، اور کپڑا دینا پڑیگا۔ اگر وہ غریب ہے تو اسی اعتبار سے وہ اس کو اجرت دے گا اسیطرح لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں اگر عورت اجرت مثل یعنی عام طور سے جتنی اجرت پر دوسری عورتیں دودھ پلاتی ہیں۔ سے زیادہ اجرت مانگے تو اس کو اجرت مثل سے زیادہ اجرت نہ دی جائے گی اور اگر بچہ والا اجرت مثل سے کم اجرت دے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس کو پوری اجرت ادا کرے،، لے

اس اقتباس سے اور باتوں کے ساتھ یہ بات بھی واضح طور پر معلوم ہوئی کہ اجرت کے معاملہ میں حکومت کو دخل دینے کا پورا حق ہے۔ اگر یہ حق نہ ہو تو پھر اجرت مثل یا معروف اجرت کا تعین کون کرے گا اور تعین کے بعد بھی اگر کوئی زیادتی ہو رہی ہو تو اس کو کون طاقت دور کر سکتی ہے؟ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے

معروف اور اجرت مثل کی تعیین کے سلسلہ میں حکومت مزدوروں کی ضرورت کے ساتھ مستاجروں کے مالی فائدہ اور منافع کو سامنے رکھ سکتی ہے۔ اگر ایک مل مالک کو سال میں ایک لاکھ کا فائدہ ہوتا ہے اور وہ صرف پچاس ہزار روپیہ اجرت میں تقسیم کرتا ہے

لے احکام القرآن : جلد ۱ : ص ۴۰۴

اور اس سے مزدور مطمئن نہیں ہیں یا ان کی واقعی اور بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی ہیں تو مزدور اس سے مزید اجرت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ نہ دے تو حکومت اس میں مداخلت کر کے ان کی اجرت میں اضافہ کرا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ اجرت معروف کے خلاف بھی ہے اور پھر ارشاد نبوی میں دونوں کو بھائی قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بات بھائی چارہ کی اسپرٹ کے خلاف ہے کہ ایک بھائی تو عیش و آرام کرے۔ اور اس کے دوسرے بھائی جن کی محنت سے اسکو یہ عیش و آرام حاصل ہے اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے بھی مجبور رہوں۔

(۳) معاہدہ کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ جس طرح ایک خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ، جو چیز لے رہا ہے اسے اچھی طرح دیکھ بھال لے اور غور و فکر کر کے لے اور دوکاندار قیمت کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے اسی طرح ایک اجیر و مستاجر کو بھی حق ہے کہ وہ دونوں اجرت اور محنت کو دیکھ کر اور اس کا اندازہ کر کے فیصلہ کریں۔ مثلاً آجر نے مزدور سے کہا کہ فلاں جگہ سے اتنی مٹی ڈھو کر میرے گھر پر لا دو یا تمہیں کارخانہ میں اتنی دیر تک مشین چلانی ہوگی اور اتنی اجرت ملے گی۔ اجیر نے منظور کر لیا مگر اس نے جب مٹی کاٹنی شروع کی تو وہ بہت سخت نکلی اور اس محنت کے اعتبار سے اجرت کم مقرر ہے تو اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس معاہدہ کو فسخ کر دے یا پھر مالک سے مزید اجرت طلب کرے۔ اسی طرح اس نے آٹھ گھنٹے مشین چلائی تو اس نے اندازہ کیا کہ میں یہ کام نہ کر سکوں گا، یا اتنی دیر تک مثلاً آٹھ گھنٹے تک مشین چلانے کی اجرت جتنی ہونی چاہیئے اس سے کم اجرت پر اس سے کام کا وعدہ لے لیا ہے تو اس کے بعد اس کو حق ہوگا کہ وہ مزید اجرت طلب کرے جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ وہ اس صورت میں اجرت معروف اور اجرت مثل کا مستحق ہوگا۔

(۴) اسی طرح اگر آجر نے ایک مزدور کو رکھا اور جب اس نے کام شروع کیا تو اس نے اندازہ کیا کہ یہ کام اس سے نہ ہو سکے گا تو پھر اس کو چاہئیے کہ اس سے دوسرا ہلکا کام لے اور اگر اس کے پاس دوسرا کام نہیں ہے تو پھر وہ اس کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں اگر کوئی فریق یہ سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق اس پر زیادتی کر رہا ہے تو وہ حکومت کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

(۵) معاہدہ کا پانچواں فائدہ یہ ہے کہ اجیر اور مستاجر دونوں انسانی حیثیت سے بھائی ہیں اور مستاجر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اجیر سے ویسا ہی معاملہ کرے۔ مستاجروں کی یہ ذہنیت نہ ہونی چاہیئے کہ اجیر کوئی کم تر درجہ کے انسان ہیں اور وہ ان سے کچھ برتر ہیں اس بھائی چارہ کا اثر اجرت کی ادائیگی میں بھی ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور پھر اسی کے ساتھ معاشرتی حیثیت سے بھی ان کو سوسائٹی میں برابر کا درجہ ملنا چاہیئے، محنت و مزدوری کرنے کی وجہ سے انہیں معاشرتی حقوق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ موٹے موٹے معاشرتی حقوق یہ ہیں۔ ان کے ساتھ کھانے میں عار نہ محسوس کرنا چاہیئے، ان کو سلام کرنے میں سبقت کرنی چاہیئے ان کی خوشی و غم میں اس طرح شریک ہونا چاہیئے جس طرح وہ تمہاری خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں ملنے جلنے میں ان سے مساوی برتاؤ رکھنا چاہیئے وغیرہ۔

معاہدہ کے بعد معاہدہ اوپر بتایا گیا ہے کہ اجیر و مستاجر دونوں کی حیثیت برابر ہے دونوں کو یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں سوچ سمجھ کر اور کام اور اجرت کی تعیین کر کے پھر معاہدہ اجرت مکمل کریں، لیکن اگر معاہدہ طے ہونے کے بعد بھی کام یا اجرت کے بارے میں دونوں کو کوئی اعتراض ہے اور وہ دوسرا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ دوبارہ معاہدہ کر سکتے ہیں، اب وہ پہلا معاہدہ فسخ ہو جائے گا

یصح شرط الخیار فی الاجارۃ (ہدایۃ)

معاہدۂ اُجرت کے صحیح ہونے کے قانونی شرائط

عام طور پر دنیا میں اجیر و مستاجر کے درمیان جو معاہدہ طے ہوتا ہے اس کی بنیاد صرف مادی فائدہ پر ہوتی ہے یعنی عام طور پر اجیر کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ مستاجر اور آجر سے ہمارا تعلق صرف یہ ہے کہ اس سے ہمیں زیادہ سے زیادہ اجرت وصول ہونی چاہیئے خواہ اس کو فائدہ ہو یا نقصان، اسی طرح مستاجر اور آجر یہ سوچتا ہے کہ اجیروں کی محنت سے ہمیں اسی وقت تک سروکار ہے جب تک کہ ان کی محنت ہمارے لئے مفید ہے۔ لیکن جب ان کی محنت ہمارے لئے بار آور نہ ہو تو پھر ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ایک مشین بیکار ہونے کے بعد پھینک دی جاتی ہے اسی طرح وہ بھی پھینک دینے کے قابل ہیں، وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ اصل فائدہ اس کو مزدوروں کی محنت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے سرمایہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے فائدہ کا اصل حق اس کو ہے اور ضمنی فائدہ کے مستحق مزدور ہیں۔

اسلامی نظام اجرت میں بھی قانونی اعتبار سے اصل چیز منفعت ہی ہے مگر ہر ہر قدم اور ہر ہر موقع پر یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ مالک و مزدور کا تعلق محض ایک مشین اور مشین چلانے والے کا نہ ہو۔ بلکہ ایسا تعلق ہو جو ایک انسان کو انسان کے ساتھ اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ جس طرح مستاجر کے سینے میں دل ہے اسی طرح مزدور کے سینہ میں بھی دل ہوتا ہے جس طرح اس کے دل میں نازک احساسات وجذبات پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مزدور کے دل میں بھی احساسات وجذبات پیدا ہوتے ہیں اس لئے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اسی حیثیت سے تعلق رکھنا اور معاملہ کرنا چاہیئے۔

مستاجر کو خاص طور پر یہ سوچنا چاہیئے کہ سرمایہ بغیر محنت بالکل بے کار ہے اور

محنت بھی سرمایہ کی محتاج ضرور ہے، مگر بغیر سرمایہ کے وہ بالکل بے کار نہیں ہے البتہ سرمایہ بغیر محنت بارآور ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ تعلق کیسے پیدا ہو اور پھر کیسے باقی رہے اس کے لیے اخلاقی ہدائتیں بھی دی گئی ہیں۔ اور قانونی ہدائتیں بھی اخلاقی ہدائیتوں کا ذکر اوپر آ چکا اور قانونی ہدائیتوں کے سلسلہ میں معاہدۂ اجرت اور اس کے فسخ کرنے کے طریقہ کا ذکر آچکا ہے۔ اب آگے یہ بتایا جائے گا کہ اس معاہدہ کے صحیح ہونے کے کون ایسے شرائط ہیں جن کی رعایت سے اجیر و مستاجر کے درمیان کش مکش کی کم سے کم صورت پیش آ سکتی ہے۔

۱۔ معاہدہ کے بعد سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اجیر و مستاجر دونوں عقل و ہوش رکھتے ہوں دونوں کا بالغ ہونا ضروری ہے اس لیے بالکل نادان بچوں یا پاگل و بے عقل بالغوں کے درمیان اجرت کا معاملہ نہیں ہو سکتا، نادان بچوں کے ولی اگر چاہیں تو ان کو اپنے کام میں شریک کر سکتے ہیں، مگر وہ براہ راست نہ تو اجیر ہو سکتے ہیں اور نہ مستاجر۔

۲۔ دونوں کی رضا مندی ضروری ہے۔ یعنی نہ تو سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا دباؤ ڈال کر ان سے کم اجرت پر کام لینے کی کوشش کرے اور نہ اجیر اپنی محنت کے ذریعہ کوئی دباؤ ڈال کر آجر سے زیادہ اجرت حاصل کرنے کی کوشش کرے مثلاً مظاہرہ یا اسٹرائک کی دھمکی وغیرہ کے ذریعہ۔

۳۔ اجرت متعین و معلوم ہونی چاہیئے۔ یعنی یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ روزانہ یا ماہانہ کتنی اجرت ملے گی اس طرح طے کرنا صحیح نہیں ہے کہ مناسب اُجرت دے دی جائے گی۔ اگر بغیر طے کیے ہوئے کسی سے کام کرا لیا تو یہ معاہدہ اجرت صحیح نہیں ہے اور اس کو اجرت مثل دینی پڑے گی۔ البتہ اگر پہلے سے

کسی کام کی اجرت عام طور پر متعین ہے۔ یا جیسا کام اور جتنا کام وہ لے رہا ہے اتنے کام کی اجرت پہلے سے مقرر ہے تو بغیر طے کیے ہوئے بھی معاملہ ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں آجیر کو اتنی ہی اجرت دینی اور اجیر کو اتنی ہی اجرت لینی پڑے گی جتنی کہ اس کام پر عام مزدوروں کو دی جاتی ہے۔ البتہ مقام کے لحاظ سے کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے مثلاً ایک مزدور کو کراچی میں جتنی مزدوری ملتی ہے اتنی کسی چھوٹے شہر میں نہیں ملتی تو کراچی کے مزدوروں کو چھوٹے شہر کے مزدوروں کی مزدوری نہیں دی جا سکتی اور نہ چھوٹے شہر کے مزدور بڑے شہر کی مزدوری کا مطالبہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ معاشی اخراجات میں دونوں جگہوں میں فرق موجود ہے۔

۴۔ اجرت کے ساتھ کام کی نوعیت جگہ اور وقت بھی معلوم ہونا چاہیے، مثلاً جو کام لینا ہے اسے وہ کام اور جگہ بتا دینی چاہیے۔ یا پھر وقت یا کام کی مقدار بتا کر اجرت طے کرنی چاہیئے۔ یعنی اگر آپ ایک مزدور رکھتے ہیں تو اس کو بتا دینا چاہیے کہ تم کو اتنی اجرت ملے گی۔ روزانہ اتنا کام کرنا ہوگا۔ اور یہ کام تم کو فلاں کارخانہ اور فلاں مقام پر کرنا ہوگا۔ یعنی کراچی میں، لاہور میں یا ملتان میں اور کپڑے کے کارخانہ میں یا جوتہ .... یا سیمنٹ یا پٹ سن کے کارخانے میں کیونکہ مقام اور کام کی نوعیت کی وجہ سے اجرت میں کمی اور زیادتی ہو جاتی ہے۔

کام کی مقدار بتا کر بھی اجرت طے کی جا سکتی ہے۔ یعنی اس طرح طے ہو کہ اتنا کام کر لوگے تو اتنی اجرت ملے گی۔ جیسا کہ عام طور پر ٹھیکہ میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر اجرت کے مقابلہ میں کام زیادہ ہوگا یا سخت ہوگا تو اتنے کام کی عام طور پر جو اجرت ملتی ہے وہ دینی پڑے گی، اسی کو اجرت مثل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ماہوار تنخواہ پر بھی مزدور رکھا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں بھی کام کی نوعیت اور مقام بتانا ضروری ہے۔

ہدایت | اگر ان میں سے کوئی شرط نہ پائی گئی تو یہ معاہدہ فاسد سمجھا جائے گا معاہدہ کے فسخ ہو جانے کی صورت میں اجیر نے جتنے دن کام کیا ہے اس کی اجرت اس کو ملے گی

باب پنجم

فسخ معاہدہ

سرمایہ دار ملکوں میں پیشہ کے انتخاب کی آزادی کے ساتھ مزدوروں کا یہ حق بھی قریب قریب تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اجرت کا تعیّن بالکلیہ آجر کی ہی مرضی پر نہ ہو بلکہ اس میں مزدوروں کی بھی رضامندی کو شامل ہونا چاہیئے مگر اس حق کے تسلیم کئے جانے کے باوجود عملاً مزدوروں کے ساتھ وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو آج سے سو برس پہلے ہوتا تھا، یہ ضرور ہے کہ اس پر کچھ خوبصورت پردے ڈال دیئے گئے ہیں ورنہ آج بھی آجر جب چاہتا ہے اپنے اغراض کے تحت ان کی اجرت گھٹا بڑھا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے ان کو کارخانہ سے نکال دینے کی دھمکی دیتا ہے اور اس قسم کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

اس کے برخلاف اسلام آجر کو خواہ کوئی فرد ہو، یا حکومت یہ حق نہیں دیتا کہ وہ جب چاہے اجرت کے معاہدہ کو توڑ دے اور اپنے معاشی اغراض کے تحت کارخانہ بند کر کے ہزاروں مزدوروں کو بے کار کر دے اور جب چاہے ان کو اخراج کی دھمکی دے دیا کرے، اسلامی قانون کے ماہرین (فقہا) نے اس مسئلہ پر مستقل بحثیں کی ہیں اور اس کے شرائط وحدود مقرر کیے ہیں۔

معاہدہ اجرت کب ختم ہو سکتا ہے اس بارے میں فقہا کی دو رائیں ہو گئی ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ:

تفسخ الاجارة بالاعذار [1]

معاہدہ اجرت عذر کی بنا پر فسخ کیا جا سکتا ہے۔

یعنی اجیر یا مستاجر کو کوئی شدید عذر لاحق ہو جائے خواہ وہ عذر اس کی ذات سے متعلق ہو یا مقصود علیہ یعنی جس کام کے لئے یہ معاہدہ ہوا ہے اس سے مثلاً مستاجر اتنا سخت بیمار پڑ جائے کہ وہ کام کی نگرانی نہ کر سکے، یا جس کارخانہ کو وہ چلا رہا تھا، اس پر کوئی ناگہانی افتاد پڑ جائے مثلاً اس میں آگ لگ جائے۔ مشین ایسی خراب ہو جائے کہ اس کو فوراً نہ چلایا جا سکے، ان صورتوں میں اس کو حق ہو گا کہ وہ معاہدہ اجرت کو فسخ کر دے۔

اسی طرح اجیر کو بھی حق ہے کہ وہ کسی عذر شدید کی بنا پر معاہدہ توڑ دے مثلاً وہ کام کے لائق نہیں رہا یا شدید بیمار پڑ گیا یا اس کی واقعی ضروریات زندگی پوری نہیں ہو رہی ہیں، یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کی رائے ہے، فقہا کے دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ محض ذاتی عذر بیماری یا بے کاری کی وجہ سے معاہدہ فسخ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عذر اس منفعت اور عمل سے متعلق ہو جس کے لئے یہ معاہدہ کیا گیا ہے۔

لا یجوز لاحد منہا فسخہا الا ان یمنع استیفاء المنفعۃ بعیب فی المعقود علیہ [2]

دونوں میں سے کسی کو اس وقت تک معاہدہ فسخ کرنے کا حق نہیں ہے،

جب تک مقصود علیہ یعنی جس مقصد کے لئے یہ معاہدہ ہوا ہے اس میں کوئی خرابی نہ پیدا ہو جائے۔

یہ رائے ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی ہے، ان دونوں رایوں میں محض اتنا فرق ہے کہ پہلی رائے میں عذر کو ذرا وسعت دی گئی ہے۔ یعنی عذر ذاتی ہو

---

[1] ہدایہ: ۳: ۳۱۲ طبع لکھنؤ۔
[2] الافصاح ابن ہبیرہ: ص ۲۴۲

یا منفعت اور کام سے متعلق ہو دونوں صورتوں میں معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہے، اور دوسری رائے میں عذر کو صرف منفعت اور مقصود علیہ سے متعلق رکھا گیا ہے۔

یعنی جب ان مواقع اور ذرائع میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے، جن پر اس معاہدہ کی بنیاد ہے جیسا کہ اوپر کی مثال میں واضح کیا گیا ہے۔ جن فقہا نے عذر کو ذرا وسعت دی ہے ان کے یہاں بھی عذر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کثیر منافع کے مقابلہ میں جب آجر کو کچھ کم نفع کی توقع ہو تو وہ کارخانہ بند کر کے مزدوروں کو بیکار کر دے یا ان کی چھانٹی شروع کر دے یا اجرت کم کر دے، بلکہ عذر کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ۔

هو عجز العاقد عن المضی فی الموجب الا بتحمل ضرر زائد لم یستحق به هذا هو معنی العذر عندنا[1]

عذر معاہدہ کرنے والے کی اس مجبوری کا نام ہے جس میں اس معاہدہ کی تکمیل سے اتنا شدید نقصان اٹھانا پڑے جو اس معاہدہ کے منشا کے خلاف ہو۔ ہمارے نزدیک عذر کا یہی مفہوم ہے۔

ان دونوں رایوں میں کوئی بنیادی اختلاف یا فرق نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق محض حالات سے ہے، جس طرح کے حالات اور مواقع ہوں ان کے مطابق اسلامی حکومت ان دونوں میں سے کوئی رائے اختیار کر سکتی ہے۔ فقہا فسخ اجارہ کے سلسلہ میں یہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک شخص کوئی مکان کرایہ پر لے اور اس میں کوئی ایسا عیب نکل آئے جس سے اس کے اندر رہنے میں تکلیف ہو تو اس کو اس معاہدہ کو ختم کرنے کا اختیار ہے اس پر مزدوروں اور مالکوں کے مسئلے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فریقین میں سے جس کو مضرت کا پہلو نظر آئے وہ ایک متعین مدت کے اندر معاہدہ کو فسخ کر سکتا ہے اس کی تعیین کے لئے حکومت

---

[1] ہدایہ: ۳: ص ۳۱۳ اصح المطابع لکھنؤ۔

قانون بنا سکتی ہے۔

اسٹرائیک اور کارخانہ بندی (Strike and Lock-out.) ان قانونی اور اخلاقی حقوق اور حدود کے بعد نہ تو مزدور کو یہ حق ہوتا ہے کہ عذر کا کوئی بہانہ بنا کر وہ جب چاہے اسٹرائیک کر دے، اور نہ کارخانہ دار کو یہ حق ہے کہ وہ جب چاہے اپنا پھاٹک بند کر کے ہزاروں مزدوروں کو بیکار کر دے۔

حکومت کی مداخلت معاہدہ یا اعذار کے سلسلہ میں اجیر اور مستاجر کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہو گا تو حکومت کا فرض ہو گا کہ وہ اس میں مداخلت کرے۔

اور حکومت فیصلہ کرنے میں بہر صورت وہی راہ اختیار کرے گی جس میں لیعنی نہ نقصان اٹھایا جائے اور نہ نقصان پہنچایا جائے) کا پہلو نمایاں ہو گا، بلکہ اس میں نفع عام ہو گا۔ جیسا کہ اسلامی قانون کے ہر معاشی مسئلہ میں اس کا خیال رکھا گیا ہے، اس کی مزید تفصیل حکومت کی مداخلت کے ضمن میں آئے گی۔

اجرت کی تعیین اجیر و مستاجر کے درمیان کش مکش اور اختلاف کا ایک بڑا سبب اجرت اور کام کی عدم تعیین ہے۔

اسی لئے اسلامی قانون میں معاہدہ اجرت کی تکمیل کے لئے یہ شرط ہے کہ اجرت منفعت اور کام سب معلوم ہونا چاہیئے، اور خاص طور سے اجرت کی تعیین کے بغیر تو یہ معاہدہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت شعیب نے حضرت موسیٰ سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں انہوں نے کام اور اجرت دونوں کی تصریح کر دی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ۔

من استاجر اجیرا فلیعلمہ اجرہ[1]

---

[1] ہدایہ ۳، ۲۹۱ مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ

جو شخص کسی کو اجرت پہ رکھے تو آجر کو چاہیئے کہ اس کو مزدوری بتا دے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

أن رسول الله صلے الله علیه وسلم نهی عن استیجارة الأجیر حتی یبین له اجره[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کی مزدوری بتائے بغیر اس سے کام لینے کو منع فرمایا ہے۔

اسی بنا پر تمام فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ۔

وان من صحتها ان تکون المنفعة والعوض معلومین[2]

اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ منفعت یعنی کام اور اجرت دونوں معلوم ہوں۔

عام طور پر معاشین تعیین شرح کے لحاظ سے اجرت کی دو قسمیں کرتے ہیں، اجرت وقت اور اجرت عمل۔ (Time wage and Work wage.)

اجرت وقت سے مراد وہ اجرت ہے جس میں شرح کی تعیین معیار اور وقت کے لحاظ سے کی جائے مثلاً سو روپے ماہانہ یا بیس روپیہ ہفتہ، اس کے مقابلہ میں اگر مزدوروں کو اجرت کام کی مقدار کے مطابق دی جائے تو وہ اجرت عمل کہلائے گی۔ مثلاً ایک تھان کپڑے کی بنائی دس روپے، ایک جلد ساز کو فی کتاب دو روپے یا ایک صفحہ کی کتابت

---

[1] سنن کبریٰ بیہقی کتاب الاجارہ ج ۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجرت کی تعیین اور مزدوری کی وضاحت پر اس لیے زیادہ زور دیا ہے کہ اس سلسلہ میں مزدوروں پر بہت زیادتی ہوتی ہے کیونکہ وہ مجبور ہوتے ہیں اور انکی مجبوری سے آجر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، پھر آپ نے "تعیین اجرت" کا اصول طے کر کے رسم بیگاری کا بھی خاتمہ کر دیا جس پر آج تک بعض ملکوں میں عمل درآمد ہوتا ہے۔ [2] الافصاح ابن ہبیرہ ص ۲۲۶، ہدایہ ۳: ۲۹۱۔

کا تین ۳ روپے وغیرہ وغیرہ

اجرت کی تعیین اور تقرر میں ایک فرق کارکردگی کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے۔ یعنی اجرت بلحاظ وقت دی جائے یا بلحاظ مقدار کار، اس میں مزدور کی محنت، مہارت اور کارکردگی کو بڑا دخل ہوتا ہے، جو مزدور محنتی سمجھدار، ماہر اور جفاکش ہوتے ہیں، ان کو ہر شخص زیادہ مزدوری دے کر کام لینا پسند کرتا ہے برخلاف اس کے سست، کاہل، بد دیانت مزدوروں کو کم سے کم اجرت ملتی ہے، اس طرح جہاں مقدار کار کے لحاظ سے اجرت دی جاتی ہے وہاں بھی پہلا مزدور دوسرے کے لحاظ میں زیادہ اجرت حاصل کرتا ہے۔ جو اجرت کارکردگی کے لحاظ سے دیجاتی ہے اس کو معاشیات کی اصطلاح میں اجرت مہارت یا اجرت کارکردگی کہتے ہیں اسلام نے تعیین اجرت میں جسمانی قوت کے ساتھ اخلاقی اوصاف کا لحاظ بھی ضروری قرار دیا ہے۔

اگر کوئی مزدور قوت جسمانی اور اخلاقی اوصاف میں نمایاں ہو تو اس کو زیادہ اجرت دینے کی اجازت ہے اور جوان اوصاف میں جس قدر کم ہو اس کو اسی اعتبار سے اجرت کم دی جائے گی، مگر اس کمی کی ایک حد ہے، جس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اسلام جفاکشی محنت، دیانت داری، مہارت اور حسن کاری کو جس قدر پسند کرتا ہے اور کاہلی سستی، کام چوری اور بد دیانتی کو جس قدر ناپسند کرتا ہے اس کا اندازہ حسب ذیل آیات و احادیث نبوی سے ہوگا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی نے جب ان سے حضرت موسیٰ کو اجیر رکھ لینے کی درخواست کی تو بطور دلیل یہ کہا کہ:

اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ ۔[1]

اچھا مزدور وہ ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔

اور اس میں دو وصف معلوم ہوتے ہیں یعنی جس میں قوت جسمانی کے ساتھ امانت کا وصف بھی ہوتا کہ وہ جس کام پر لگایا جائے، اس کو دیانت داری سے انجام دے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

الخازن الامین الذی یودی ما امر به طيبة نفسه۔

خازن اور امین وہ شخص ہے کہ اس کو جو کام سپرد کیا جائے، اس کو نہایت خندہ پیشانی سے انجام دے۔

مہارت اور حسن کاری کو بھی اسلام پسند اور اس کی ہمت افزائی کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ جو کام بھی کیا جائے، اس میں خوش نمائی اور پائیداری ہو۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی صنعت گری کا یہ وصف بتلایا ہے

صنع الله الذی اتقن کل شئ ۔ (النحل : ۸۸)

اللہ کی یہ صنعت گری ہے کہ اس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے۔

حضرت عائشہ بیان فرماتی ہیں کہ حضور انور نے ایک بار فرمایا،

ان الله یحب اذا عمل احدکم عملا ان یتقنه[2]

خدا کو یہ بات پسند ہے کہ تم جب کوئی کام کرو تو اس میں خوبی اور مضبوطی کا خیال رکھو۔

---

[1] قصص : ۲۰ ۔

[2] بخاری ۱ : ۳۰۱ مطبوعہ کرزن پریس دہلی ۔

کتاب وسنت کی ان ہدایات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) اگر مزدور کو جسمانی قوت اور اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے کم وبیش اجرت دی جائے تو یہ اسلامی قانون اجرت کے منافی نہ ہوگا۔

(۲) کارکردگی، مہارت اور حسن کاری کے لحاظ سے بھی اجرت مقرر کی جاسکتی ہے

اجرت کی قسمیں اور مقدار

اجرت کے سلسلہ میں سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ مسئلہ اس کی مقدار کا ہے۔ بعض پیچیدگیوں اور اس کے موجودہ حل کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، اب اس کی مزید تفصیل کی جاتی ہے۔

عام طور پر علمائے معاشیات اجرت کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک ادائیگی کے لحاظ سے دوسرے شرح تعیین کے لحاظ سے شرح تعیین کی تفصیل گذر چکی ہے، ادائیگی کے لحاظ سے اجرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اجرت متعارفہ، دوسری اجرت صحیحہ، اجرت متعارفہ سے مراد زر کی وہ مقدار ہے، جو مزدور کو اس کی محنت کے معاوضہ میں ادا کی جائے، مثلاً دس روپیہ روزانہ یا تین سو روپے ماہوار، اور اس رقم سے مزدور جو ضروریات زندگی، خوراک، لباس، مکان، علاج اور تعلیم حاصل کرتا ہے وہ اس کی اجرت صحیحہ کہلائے گی، اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ مزدور کے لئے اصل چیز مقدار زر نہیں بلکہ مقدار ضروریات ہے، ہر شخص کسب معاش کے لئے محنت کرتا ہے اور معاش چند سکوں اور کاغذ کے پرزوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اشیاء کے اس مجموعہ کا نام ہے جنہیں وہ سکے دے کر خریدتا ہے اور ان سے اپنی احتیاجات پوری کرتا ہے محنت کے معاوضہ میں رقم قبول کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے اس کی مقبولیت کا علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ذریعہ جب

چاہے وہ اپنی مطلوبہ چیزیں خرید سکتا ہے اگر کسی وجہ سے زر کی مقبولیت جاتی رہے تو کوئی مزدور کبھی اپنی محنت کا معاوضہ زر کی شکل میں قبول کرنے پر تیار نہ ہوگا۔ مختصر یہ کہ اجرت کے سلسلہ میں محنت کش طبقہ کے پیش نظر اصل مقصد زیادہ سے زیادہ ضروریات زندگی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مقدار زر سے اس کو کوئی خاص سروکار نہیں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر زر کی تھوڑی سی مقدار سے زیادہ ضروریات پوری ہوں، تو مزدور معاشی حیثیت سے مطمئن ہوگا اس کے برعکس اگر اسے مقدار زر تو زیادہ حاصل ہو مگر اس سے ضروریات کم پوری ہوں تو مزدور کبھی خوش اور مطمئن نہیں ہو سکتا، اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں کے نقطۂ نظر سے دراصل جو چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ اجرت متعارفہ نہیں بلکہ اجرت صحیحہ ہے کیونکہ اس کی خوش حالی کا تمام دارومدار اسی پر ہے اب اجرت صحیحہ میں اضافہ کی تین صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اشیاء کا نرخ معین رہے، اور اجرت متعارفہ بڑھ جائے۔ دوسری صورت یہ کہ اجرت متعارفہ تو معین رہے، اور ضروریات زندگی ارزاں ہو جائیں تیسری صورت یہ کہ اجرت متعارفہ میں اضافہ بھی ہو اور نرخ ضروریات میں بھی تخفیف ہو۔ موجودہ معاشیین کے نزدیک مزدوروں کے حق میں یہ صورت سب سے زیادہ فائدہ بخش اور قابل اطمینان ہے، اس لئے کہ ایک طرف تو اجرت متعارفہ میں برابر اضافہ جاری ہے دوسری طرف ضروریات روز بروز ارزاں ہوتی جاتی ہیں جس کی وجہ سے اس کی اجرت صحیحہ میں دوگونہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں قریب قریب ہر ملک کا خواہ وہ سرمایہ دار ممالک ہوں یا اشتراکی حال یہ ہے کہ وہاں ایک طرف اجرت متعارفہ میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، دوسری طرف ضروریات زندگی روز بروز گراں ہوتی جا رہی ہیں، چنانچہ روس میں پانچ سو یا ہزار روبل پانے والا مزدور جب بازار میں اپنی ضروریات خریدنے جاتا ہے تو اس کو

مہینہ بھر آلو اور روٹی پر گذر کرنا پڑتا ہے، اور اس میں سے پیٹ کاٹ کر وہ کسی طرح اپنی دوسری ضرورتیں پوری کرتا ہے خود ہندوستان و پاکستان کا بھی حال یہی ہے، آج سے پچیس برس پہلے ایک مزدور چالیس پچاس روپیہ ماہوار مزدوری پاکر خوش اور مطمئن رہتا تھا آج دو ڈھائی سو روپیہ پانے والا مزدور اتنا خوش اور مطمئن نہیں ہے حالانکہ اس کی اجرت متعارفہ میں تین گنا اضافہ ہو گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کی اجرت متعارفہ میں چوگنا اضافہ ہوا ہے تو ضروریات کے نرخ میں چھ گنا اور آٹھ گنا اضافہ ہو گیا ہے، اس وجہ سے اجرت متعارفہ میں اضافہ کے باوجود اس کی اجرت صحیحہ میں کمی ہوئی ہے، اور اس کے اطمینان کے لئے ضروری ہے کہ اجرت صحیحہ میں اضافہ ہو۔

یہ تفصیل موجودہ معاشی علماء کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے کہ اصل چیز اجرت صحیحہ کا اضافہ ہے اس میں جتنا اضافہ ہو گا مزدور اسی قدر مطمئن ہو گا۔ موجودہ دور کے علمائے معاشیات کا یہ نظریہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ مزدور کے نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت اجرت متعارفہ کی نہیں بلکہ اجرت صحیحہ کی ہے مگر خود اجرت صحیحہ کے معیار کی تعیین اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ایک دشوار کام ہے اس کے علاوہ اجرت صحیحہ کے سلسلہ میں کچھ اور سوالات بھی سامنے آتے ہیں، خاص طور سے یہ بات کہ موجودہ نظام معیشت کی موجودگی میں کیا اس کا امکان ہے کہ اجرت صحیحہ میں قابل اطمینان حد تک اضافہ ہو جائے، اور پھر کیا اجرت صحیحہ کا محض اضافہ ہی ان کے اطمینان کا موجب ہو سکتا ہے؟ کیا مزدوروں کے سامنے معاشی الجھنوں کے علاوہ معاشرتی، نفسیاتی اور جذباتی الجھنیں نہیں ہوتیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ انسان خواہ کتنا ہی مادہ پرست ہو جائے وہ محض مادی ضروریات کا مجموعہ نہیں کہ تنہا اس کی فراہمی اس کے سکون واطمینان کا سبب ہو بلکہ اس کے سینہ میں ایک متحرک، زندہ اور حساس دل بھی ہے جس میں

محبت ونفرت، عزت و ذلت، امید وخوف تعاون وعدم تعاون جیسے فطری جذبات موجود ہوتے ہیں، اگر انسان کی ساری مادی ضروریات پوری ہو جائیں۔ مگر اس کے دل کے ان جذبات کی تسکین، وتشفی کا کوئی سامان نہ ہو تو وہ کبھی بھی اپنے کو مطمئن نہیں پا سکتا اس کے نزدیک یہ جذبات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ ان کی تسکین کی خاطر بسا اوقات مادی منفعت کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔ مثلاً اگر اس کو ایک ہزار ماہوار اجرت ملتی ہے لیکن معاشرہ میں اس کو وہ مقام اور عزت حاصل نہ ہو جو بعض دوسرے کم آمدنی والوں کو حاصل ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ محض اضافہ اجرت اجیر کی زندگی کے مسئلہ کا واحد حل ہو سکتا ہے

ایسی صورت میں اضافۂ اجرت ہی کو مزدوروں کے مسئلہ کا حل سمجھنا ایک شدید قسم کی غلطی اور خود فریبی ہے مزدوروں کے سینوں میں ان جذبات سے خالی کوئی دل نہیں ہوتا۔

اُجرت صحیحہ میں اضافہ کس وقت ممکن ہے

اجرت صحیحہ میں اضافہ اسی وقت ممکن ہے جب ضروریاتِ زندگی ارزاں ہوں محض اجرت متعارفہ یعنی رقم کا اضافہ اس کے لئے کافی نہیں ہے، اوپر روس کی مثال پیش کی گئی ہے کہ وہاں اجرت متعارفہ گو بہت بڑھی ہوئی ہے مگر اشیاء گراں ہیں، اس لئے مزدوروں کی زندگی میں فارغ البالی کا فقدان ہے، اجرت متعارفہ کے اضافہ سے مزدوروں کو عارضی طور پر کچھ راحت اور آسانی ضرور ہو جاتی ہے، مگر اس سے مستقل طور پر ان کی پریشانی دور نہیں ہوتی، اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اشیاء ضروریات کے نرخ میں تخفیف ہو۔

مگر نرخ میں تخفیف اور ارزانی کس طرح پیدا ہو اس کا کوئی معقول حل معاشیین کے پاس نہیں ہے ایک طرف قانون تقلیل حاصل اور اضافہ آبادی اشیاء کی قیمت ارزاں

میں مزاحم ہوتے ہیں، دوسری طرف ضروریات زندگی پیدا کرنے والوں کے لئے اگر یہ ارزانی مضر ثابت ہو تو وہ بھی اس میں رکاوٹ پیدا کریں گے، مثلاً کسان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ غلہ کا بھاؤ بجائے گرنے کے چڑھتا رہے، صنعت کاروں اور کارخانہ داروں کے لئے ارزانی کے مقابلہ میں گرانی زیادہ نفع بخش ہوتی ہے اس لئے وہ بھی اشیاء کی ارزانی کو پسند نہیں کرتے، خالص مادی نظام حیات میں اس کا امکان اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اس میں ذاتی منفعت اور افادیت ہی قوت محرکہ ہوتی ہے مشترکہ مفاد اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بہت کم پایا جاتا ہے اس کی تازہ مثال ہندوستان میں ۱۹۷۵ء میں غلہ کی خفیف سی ارزانی ہے۔ کئی سال کے بعد عام بازار میں غلہ کی تھوڑی سی ارزانی ہوئی تھی مگر اس سے نہ کسان ہی خوش ہوئے اور نہ حکومت، چنانچہ اس ارزانی کو روکنے کے لئے حکومت نے خود غلہ کی خریداری شروع کر دی اور اس طرح غلہ کی ارزانی رک گئی۔

مسٹر ٹاسگ خالص مادی ذہن کے آدمی ہیں لیکن کبھی کبھی جب ان کی اخلاقی حس بیدار ہوتی ہے تو بہت سی پتہ کی باتیں کہہ جاتے ہیں، چنانچہ ایک جگہ افادی ذہنیت کے بارے میں لکھتے ہیں،

> انسان مستقل اور موثر طور پر اس وقت تک محنت نہ کرے گا جب تک اس کا ذاتی مفاد اس میں مضمر نہ ہو، محنت ایک تکلیف دہ چیز ہے، اور مشترکہ مفاد کا احساس کمزور رہے، اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ مشترکہ مفاد کا احساس گہرا اور قوی ہوتا ہے، اکثر آدمیوں کو اپنے بنی نوع کی خدمت کرنے کی بہت قوی تحریک ہوتی ہے اور اپنے اعزہ واقرباء کی خوش حالی بڑھانے میں جس قدر سرگرمی کے ساتھ کوشش کریں گے اسی قدر اپنے دور کے جان پہچان کے لوگوں کے لئے بھی کریں گے

تو تمام معاشرتی اور معاشی مسائل سے متعلق خیالات کا طرزِ عمل اساسی طور پر مختلف ہو جائے گا۔

حق یہ ہے کہ اگر انسان کلیتہً مجسم خود غرض نہیں ہے جیسا کہ لذتیے (Epicureans.) کہتے ہیں اور نہ انسان کا دل خدمات انجام دینے کے لئے اس قدر مملو ہوتا ہے کہ یہ محنت و مشقت برداشت کرنے کے لئے قوت محرکہ کا کام دے۔ پھر بھی دوسری انتہا کے مقابلہ میں وہ پہلی انتہا سے بہت زیادہ قریب ہے۔

رہا یہ امر کہ تعلیم، ماحول اور اعلیٰ درجہ کی اثر ڈالنے والی معاشرتی فضا کے ذریعہ سے انسانی صفات و خصائل کی ترمیم و اصلاح کے امکانات کس قدر عظیم ہیں، تو اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔[۱]

مسٹر ٹاسگ کے سامنے اس سلسلہ میں چونکہ کوئی خدائی ہدایت موجود نہیں ہے اس لئے وہ یہاں پہنچ کر اپنی لاعلمی ظاہر کر کے سمجھتے ہیں کہ ان کا فرض ادا ہو گیا مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، اس کے امکانات بہت زیادہ ہیں بشرطیکہ ان بنیادوں پر انسانیت کی تعمیر کی جائے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ جب تک انسان کی مادی ذہنیت اور نفع اندوزی کے بے قید اور بڑھے ہوئے جذبہ کی اصلاح نہ ہو جائے اس وقت تک اشیاء کے نرخ میں کوئی دوامی ارزانی پیدا ہونا مشکل ہے، نرخ کی تخفیف کے سلسلہ میں بعض دوسری چیزیں بھی سدِ راہ بنتی ہیں، مثلاً سامانِ تعیش کی فراوانی ذخیرہ اندوزی حکومت کے کارکنوں کی مسرفانہ زندگی جنگی فضا اور سامانِ جنگ کی وسعت میں تیزی وغیرہ۔

جس ملک میں سامانِ تعیش کی جس قدر فراوانی ہوگی اور حکومت کے کارکن جس قدر مسرفانہ زندگی بسر کریں گے، وہاں کی اجرتِ صحیحہ اسی قدر زیادہ ہوگی، اس لئے

---

[۱] مسٹر ٹاسگ: اصولِ معاشیات: ص ۳۰۳

کہ مزدور اپنی اجرت صحیحہ کی تعیین کے وقت بہرحال سامان تعیش کی ایک لمبی فہرست اور مسرفانہ زندگی کا ایک نمونہ پیش نظر رکھے گا، اور یہ پابندی مزدوروں پر نہیں لگائی جاسکتی کہ وہ اپنی اجرت صحیحہ کو اس حد یا اس معیار سے آگے نہ بڑھنے دیں کیونکہ اس تحدید کے لئے کوئی معقول دلیل ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ جو خود مفاد پرستی اور عیش کوشی کا شکار ہیں اور جنھوں نے ملک میں ایک مصنوعی تمدن پیدا کر دیا ہے، اور خود اس سے دل کھول کر لذت حاصل کر رہے ہیں۔ جنگی فضا کا اثر ضروریات زندگی پر اس طرح پڑتا ہے کہ یہ فضا جتنی زیادہ ہوگی حکومت اور صنعتی ادارے اسی قدر جنگی سامان بنانے میں مشغول ہوں گے، اور مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ اجرت متعارفہ دے کر اس میں کھپانے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور جب مزدوروں کی ایک کثیر تعداد ایک ایسی صنعت میں لگ جائے گی جس کا تعلق ضروریات زندگی سے متعلق نہیں یا برائے نام ہے تو ملک کی دوسری صنعتوں پر اس کا برا اثر پڑنا ناگزیر ہے، یہی نہیں بلکہ اس فضا میں جو ضروریات زندگی پیدا بھی ہوں گی، ان کی ذخیرہ اندوزی شروع ہو جائے گی، اس لئے کہ سرمایہ دار ذخیرہ اندوزی اسی وقت زیادہ کرتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ملک میں کوئی ہنگامی فضا پیدا ہو گئی ہے یا مستقبل قریب میں ایسی فضا پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اس ذخیرہ اندوزی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لامحالہ اشیاء کی گرانی کی صورت میں مزدوروں کی اجرت متعارفہ میں اضافہ کے باوجود گرانی کی وجہ سے ان کی اجرت صحیحہ میں کمی آجاتی ہے۔

یہ تو چند باتیں عرض کی گئیں، عام معاشیین نے اس پر مستقل بحث کی ہے کہ اجرت صحیحہ کا اندازہ کیسے لگایا جائے اور اس کے معیار میں دوام کیسے پیدا کیا جائے مگر اس بارے میں وہ کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں، اگر بفرض محال اجرت صحیحہ میں اس حد تک اضافہ ہو بھی جائے جس سے مزدور اپنے کو مطمئن محسوس کرے تو کیا محض اضافہ

اجرت ہی مزدوروں کے مستقل اطمینان وسکون کا واحد سبب بن سکتا ہے اور کیا ملک کی معاشرت اور معاش پر لازمی طور پر اس کا اچھا ہی اثر مرتب ہوگا نہ صرف اسلام بلکہ خالص مادی نقطۂ نظر سے بھی اس کا جواب نفی میں ہے چنانچہ موجودہ دور کے بعض معاشیین کی بھی یہی رائے ہے مسٹر ٹاسگ لکھتے ہیں۔

طریق اجرت اپنی بہترین شکل میں بھی خوشحالی کے منبع کو مسدود کر دیتا ہے مقصد یہ ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اجرت کی زیادتی آدمی کی خوشحالی کا سبب بن جائے مسٹر ٹاسگ کا یہ بھی خیال ہے کہ خوشحالی کی کمی حقیقتہً کوئی نقصان نہیں ہے، چنانچہ لکھتے ہیں بہرصورت یہ امر قابل ذکر ہے کہ نہ صرف روحانی بلکہ مادی پہلو سے بھی اجرت کے نظام کے تحت انسانی خوشحالی کی کمی کوئی خالص نقصان نہیں ہے۔

ایک دوسرے عالم معاشیات کی رائے ہے۔

بعض صورتوں میں اضافہ اجرت مزدوروں کے حق میں مفید ہوتا ہے تو بعض صورتوں میں مضر اور بعض میں اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، مزدور پر اضافہ اجرت کا اثر معلوم کرنے کے لئے اوّلاً دریافت کرنا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی مزید اجرت کتنی قسم کے احتیاجات پر صرف کرتا ہے کیونکہ اس پر اضافہ اجرت کے اچھے یا بُرے نتائج کا انحصار ہے، غور کرنے سے ہم انسانی احتیاجات کو تین مختلف عنوانوں میں منقسم پاتے ہیں۔ ایک تو وہ ضروریات ہیں جو بقائے حیات کے لئے ناگزیر ہیں، مثلاً خوراک، لباس مکان، دوسرے وہ ضروریات جن کی تکمیل کارکردگی قائم رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لئے لازمی ہیں، مثلاً مقوی غذا حسب ضروریات لباس ومکان، عمدہ آب وہوا آرام وتفریح کے

مواقع وغیرہ تیسرے وہ تعیشات ہیں جو بقائے حیات کیلئے ناگزیر ہیں اور نہ قیام کارکردگی کیلئے بلکہ جو لبسا اوقات مزدوروں کے اخلاق وعادات اوران کی جسمانی ودماغی حالت کو خراب کرکے ان کی کارکردگی کے لئے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں،،

اضافۂ اجرت سے اچھے نتائج کب برآمد ہوتے ہیں، اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں اضافۂ اجرت کے بہترین نتائج نہ صرف اجرت پانے والوں کے حق میں بلکہ بہ حیثیت مجموعی تمام ملک کے لئے اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ مزدور اپنی مزید اجرت ضروریات کارکردگی کی تکمیل پر صرف کرے اس کے برعکس اگر اضافہ اجرت کی وجہ سے مزدور تعیشات میں مبتلا ہوجائیں، تو یہ صورت نہ صرف مزدوروں کے حق میں بلکہ لبسا اوقات سارے ملک کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے،، [1]

مگر کیا موجودہ نظام ہائے حیات میں کوئی قانونی یا اخلاقی ضابطہ ایسا ہے جو مزدوروں کو اضافۂ اجرت کے مضر اثرات اوراس کے نتائج سے بچا سکے اوراگر ہو بھی تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک طرف سامان تعیش کی فراوانی اپنی انتہا پر ہو اخلاق کو بگاڑنے والے عوامل آزادی سے اپنا کام کر رہے ہوں افراد کو برائی سے باز رکھنے کے لیے سوائے قانون کے اور کوئی مؤثر قوت موجود نہ ہو، ایسی صورت میں ان مزدوروں پر کوئی ایسی پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اجرت کو تعیش کے بجائے محض اپنی قوت کو بڑھانے میں صرف کریں اور اگر پابندی لگائی جائے تو کیا اس کی کامیابی کا کوئی امکان ہے۔

اس سلسلہ میں جو لوگ امریکہ اور برطانیہ کو مثال میں پیش کرتے ہیں وہاں مزدوروں

---

[1] معاشیات از حبیب الرحمٰن ص ۲۲۰۔

کو عام طور پر ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنی اجرت کارکردگی بڑھانے میں صرف کریں اور وہاں کے مزدور اس پر عمل بھی کرتے ہیں، ان کو ان ملکوں کے جرائم کی فہرست پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے، اور یہ جرائم کسی مخصوص نوع کے نہیں ہوتے بلکہ ہر نوع کے ہوتے ہیں، اگر واقعی ان ملکوں میں مزدور بڑے بلند کردار عالی حوصلہ ہوتے تو پھر امریکہ اور فرانس میں شراب بندی اسکیم فیل نہ ہوتی، کیا یہ ممکن ہے کہ ملک کی اکثریت یعنی مزدور پیشہ شراب نوشی میں مبتلا نہ ہوتی، اور نہ یہ اسکیم فیل ہو جاتی، غرض خالص مادی نقطۂ نظر سے بھی اضافہ اجرت متعارفہ (Nominal Wage.) کی صورت میں ہو، یا اجرت صحیحہ کی شکل میں، بہر صورت مفید نہیں ہوتا۔

باب ششم

اِسلامی معیارِ اُجرت

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی مزدوروں کی اجرت کا معیار اجرت متعارفہ Nominal Wage نہیں بلکہ اجرت صحیحہ Real Wage ہے۔ یعنی ان کو اتنی اجرت ملنی چاہیے جس سے ان کی بنیادی ضرورت پوری ہو سکے۔ بشرطیکہ آجر اور مستاجر کے منافع میں بھی اس کی گنجائش ہو۔ ان کی بنیادی ضرورتیں غذا، لباس اور مکان ہی نہیں بلکہ اس میں علاج اور تعلیم بھی شامل ہے۔ اگرچہ علاج اور تعلیم کی ذمہ داری خود حکومت پر ہو گی اور وہی اس کی پالیسی بنائے گی اور اس کو عملاً نافذ کرے گی[1] مگر مزدوروں کی اجرت میں اتنی وسعت تو بہرحال ملحوظ رکھی جائے گی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق سرکاری درس گاہوں کے بجائے پرائیویٹ اداروں میں تعلیم دلائیں اور سرکاری شفاخانوں کے بجائے پرائیویٹ ڈاکٹر کو بلا کر اپنے گھر پر علاج کرائیں۔ اس کے لیے ان کو پورا موقع بھی موجود ہونا چاہیے اور جیب میں پیسہ بھی۔

---

[1] علاج اور تعلیم کے بارے میں حکومت کی بنیادی پالیسی تو بہرحال ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑے گی۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حکومت کی قائم کردہ تعلیم گاہوں اور اسپتالوں میں داخلہ پر مجبور رکھی ہو۔ اس میں بہرحال اس کو آزادی ہو گی۔

تعین اُجرت کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات

قرآن پاک میں نکاح، وصیت اور رضاعت کے بیان میں جہاں جہاں معاوضہ یا اُجرت دینے کا ذکر ہے وہاں قرآن پاک نے لفظ "معروف" کا استعمال کیا ہے، یعنی اُجرت اور مزدوری معروف طریقہ پر دی جائے، مثلاً دودھ پلانے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے ہدایت دی ہے:

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ [1]

اگر تم کسی دوسری عورت سے اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہتے ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے اگر تم معروف طریقہ پر ان کو اجرت دو۔

اس ٹکڑے میں ان کو معروف طریقہ پر اجرت دینے کا ذکر ہے۔ جس کے معنی بہت وسیع ہیں۔ آگے اس کی وضاحت آرہی ہے۔ اس آیت سے پہلے ماؤں کے دودھ پلانے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ:

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا [2]

کسی آدمی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائیگی۔

اس کے بعد پھر ہدایت دی کہ۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ [3]

نہ تو ماں کو بچہ کی وجہ سے کوئی تکلیف دی جائے گی اور نہ باپ بچہ کی وجہ سے زحمت میں ڈالا جائے گا۔

[1] بقرہ: ۲۳۳۔
[2] ایضاً۔
[3] ایضاً۔

بالکل یہی دونوں شرطیں اس دودھ پلانے والی کے لیے بھی ہیں، جو اس کی ماں نہیں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے آٹھ برس تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائی تھیں۔ حضرت شعیبؑ اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کو قرآن نے نقل کیا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے کہا کہ اگر آپ نے ہماری بکریاں آٹھ برس تک چرائیں، تو میں اپنی لڑکی کا نکاح آپ سے کر دوں گا۔ اس کے بعد حضرت شعیبؑ نے کہا:

فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ [1]

اگر تم دس برس پورے کر دو تو یہ تمہارا احسان ہوگا اور میں تمہارے اوپر کوئی سختی اور زیادتی کرنا نہیں چاہتا ان شاء اللہ تم مجھے اچھا آدمی پاؤ گے۔

ایک مستاجر یا مالک کے طرزِ عمل اور مزدور کے کام کی مقدار اور اس کی اجرت کے تعین کے سلسلہ میں حضرت شعیب نے خود ہی صراحت سے کہہ دیا کہ یہ کام کرنا ہوگا اور کام یا اجرت کی ادائیگی میں کوئی زیادتی نہیں کروں گا انشاء اللہ تم مجھے اچھا آدمی پاؤ گے۔ لیکن ایک اجیر کا بھی حق ہے کہ وہ بھی اپنی حیثیت واضح کر دے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے ان کے جواب میں کہا۔

ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ [2]

میرے اور آپ کے درمیان یہ طے شدہ معاہدہ ہے تو اس سلسلہ میں دونوں مدت میں سے جس مدت تک چاہوں گا کام کروں گا اس سلسلہ

---

[1] القصص: ۲۷

[2] القصص: ۲۸

میں میرے اوپر کوئی جبر نہ کیا جائے۔ اور ہم جو بات طے کر رہے ہیں اللہ اس کا اصل نگراں ہے۔

ان آیات سے فقہاء نے بے شمار مسائل اجرت اخذ کیے ہیں۔ جس طرح قرآن پاک نے نکاح، وصیت رضاعت اور اجرت کے سلسلہ میں ہر جگہ "معروف" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی اجرت معروف طریقہ پر دی جائے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اجرت کے سلسلہ میں اور بعض دوسرے مواقع پر بھی لفظ "معروف" استعمال فرمایا ہے۔ اجیر کے بارے میں فرمایا کہ طعامہ وکسوتہ بالمعروف اس کا کھانا کپڑا عام معروف طریقہ پر دیا جائے۔ اسی معروف اور عرف وعادت کے تحت فقہاء نے بے شمار احکام میں تطبیق اور تعیین سے کام لیا ہے۔ علامہ جصاصؒ اپنی کتاب "احکام القرآن" میں لفظ معروف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فاذا شطت المرأة وطلبت من النفقة اكثر من المعتاد والمتعارف لمثلها لم تعط وكذالك اذا اقصر الزوج عن مقدار نفقة مثلها في العرف والعادة لم يحل ذلك واجبر على نفقة مثلها۔[1]

اگر کوئی عورت زیادتی کرے اور اجرت مثل سے زیادہ طلب کرے تو اس کو اجرت مثل (یعنی اس کے لیے عام طور سے جتنے اخراجات دیے جاتے ہیں) سے زیادہ اخراجات نہیں دیے جائیں گے۔ اسی طرح اگر شوہر اس سے کم اجرت اور اخراجات دے جتنا عام طور پر رواج ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے اور اسے اتنی اجرت اور خرچ دینے پر مجبور کیا جائے گا۔

---

[1] احکام القرآن: جلد ا، ص ۴۰۴

پھر اسی آیت کے ٹکڑے

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا [1]

کسی شخص پر اسکی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے گا۔

کے تحت کہتے ہیں کہ اگر دودھ پلانے والی اجرت مثل سے زیادہ مانگے تو اس کو اجرت مثل سے زیادہ اجرت نہیں دی جائے گی۔ اور اگر بچہ والا اجرت مثل سے کم اجرت دے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ پوری اجرت دے۔

ان آیات سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ آجر اور مستاجر دونوں کی حیثیت مساویانہ ہے۔ دونوں اپنی رضامندی سے معاہدہ کرتے ہیں اور دونوں پر اس معاہدہ کی امانت دارانہ پابندی ضروری ہے۔

۲۔ کام کے لینے میں اور کام کے کرنے میں دونوں کی صلاحیت اور قوت کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر دونوں یا کوئی ایک فریق اپنے اوپر زیادتی محسوس کرتا ہے تو اسے معاہدہ فسخ کرنے کا حق ہے۔

۳ اجرت کے دینے اور اجرت لینے میں بھی دونوں کی حیثیت اور ضرورت کا لحاظ کیا جائے گا۔

۴ کوئی مستاجر کسی اجیر کو بازار کی عام اجرت یا اس طرح کے کاموں کی جو اجرت حکومت نے مقرر کر دی ہے نہ اس سے کم اجرت دے گا اور نہ اس کو کسی اور

---

[1] بقرہ : ۲۳۳

طریقہ سے استحصال کا موقع دیا جائے گا۔ اور حکومت پوری اجرت دلائیگی۔ اسی طرح اجیر کو بھی اتنے مطالبہ کا حق نہیں دیا جائے گا کہ مستاجر کے کام کو فائدے کے بجائے نقصان میں تبدیل کر دے۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ہدایات کے ساتھ حسب ذیل احادیث نبوی اور آثار صحابہ بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک بار حضرت ابوذر غفاری رضؓ نے کسی عجمی غلام کو برا بھلا کہا۔ غلام نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ نے حضرت ابوذر کو تنبیہ فرمائی کہ تم میں اب تک جاہلیت کی بو باقی ہے۔ انہوں نے فرمایا، یا رسول اللہ! کیا اس بڑھاپے میں؟ فرمایا ہاں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن جعل اللہ اخاہ تحت ایدیہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس [1]

تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، خدا نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے . . . تو جس کے ماتحت خدا نے اس کے کسی بھائی کو کر دیا ہے اسے چاہیے کہ جو وہ خود کھائے وہ ان کو کھلائے اور جو خود پہنے ان کو پہنائے۔

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ کا یہ حال ہو گیا کہ ان کے پاس ایک چادر بھی آجاتی تھی تو نصف اپنے غلام کو دے دیا کرتے تھے اور نصف خود استعمال کرتے تھے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جن سے تم کام لیتے ہو ان کی غذا اور لباس کی ذمہ داری بھی تمہارے اوپر ہے۔

ایک صحابی رضؓ نے پوچھا کہ میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کے اوپر صرف کرو۔ پھر پوچھا کہ ایک اور دینار ہے۔ فرمایا اپنے بچوں پر صرف کرو۔ انہوں نے کہا کہ ایک دینار اور ہے۔ فرمایا اپنے خادم پر صرف کرو۔

---

[1] بخاری: ج ۲: ص ۸۹۴: مطبوعہ کرزن پریس دہلی

یعنی آپ نے جہاں اس کے مال میں بچوں کا حق مقرر کیا اسی کے ساتھ ان لوگوں کا حق بھی مقرر فرمایا جو ان کے یہاں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ میرے پاس ایک دینار اور رہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو اپنی صواب دید سے جہاں چاہو خرچ کرو۔

ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عمال حکومتؓ کو ہدایت دی کہ جو لوگ مقروض ہوں ان کے قرض حکومت کے بیت المال سے ادا کر دیئے جائیں۔ عمال حکومت نے انہیں لکھا کہ ایسے لوگ بھی اس فہرست میں آتے ہیں جن کے مکان بھی ہے، سواری بھی ہے۔ گھر کے اندر ساز وسامان بھی موجود ہے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ کیا ایسے لوگوں کا قرض ادا کرنا صحیح ہوگا؟ آپ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ یہ چیزیں ہر مسلمان کے لیے لازمہ حیات ہیں۔ ان چیزوں کے باوجود اگر وہ مقروض ہیں تو

فاقضوا عنه فانهٗ غارم [1]

ان کا قرض ادا کرو کہ یہ قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت کے ایک باشندہ کے لیے خواہ مزدور ہو یا کسان، یہ چیزیں بہرحال فراہم ہونی چاہئیں۔ اور آجر کو اجرت دیتے وقت اس کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ اگر اس کی اجرت میں اس کا لحاظ نہ کیا جائے گا تو پھر اس کی یہ ضرورتیں کیسے پوری ہو سکتی ہیں۔

علاج و تعلیم کے سلسلہ میں قرآن کی آیات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے اسوہ حسنہ کو سامنے رکھا جائے تو اس کی اہمیت خود بخود سامنے آجائے گی۔

قرآن مجید نے مرض کو اتنی اہمیت دی ہے کہ بیماری کی حالت میں بہت

---

[1] کتاب الاموال صفحہ ۵۵۶۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ اسوہ ابوعبیدہؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفسیر میں نقل کیا ہے انما الصدقة عن ظهر غنی (زکوٰۃ مالداروں پر واجب ہے) اور محض بنیادی ضرورتیں رکھنے والا آدمی مالدار

سے احکام کی پابندی مثلاً جمعہ اور جماعت کی پابندی اٹھالی ہے۔ حتیٰ کہ جہاد، جو افضل العبادات ہے اس کی ذمہ داری اس حالت میں ساقط کر دی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود مریضوں کی عیادت اور تیمارداری فرماتے تھے۔ اور لوگوں کو اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

امام ابن قیم لکھتے ہیں:-

من هديه صلى الله عليه وسلم فعل التداوي في نفسه والامر من اصابه مرض[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ تھا کہ آپ نے خود اپنا علاج کرایا ہے اور دوسروں کو بوقت بیماری اس کا حکم دیا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے افراد کے لیے آپ نے جو چھ چیزیں ضروری قرار دی ہیں ان میں ایک عیادت مریض بھی ہے۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ تم میں سے آج مسکین کو کس نے کھانا کھلایا ہے؟ تم میں سے آج مریض کی عیادت کس نے کی ہے؟ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کی زبان سے ہر ہر سوال کے جواب میں "ہاں" نکلی۔ آپ نے فرمایا یہ سب چیزیں جس شخص میں جمع ہو جائیں وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا[2]۔

ایک بار حضرت ابی بن کعب بیمار پڑے تو آپ نے ایک طبیب کو بھیجا جس نے آپ کا علاج کیا[3]۔

ایک حدیث میں ہے کہ اگر کوئی اناڑی ڈاکٹر علاج کرے اور مریض کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس سے تاوان لیا جائے گا۔

---

[1] الطب النبی: ص ۶۔
[2] مختصر مسلم شریف: ج ۱: ص ۱۴۸: طبع کویت۔
[3] مسند احمد: ج ۳: ص ۱۱۸، مشکوٰۃ: ص ۳۸۷۔

من طبب ولم یعلم منہ طب قبل ذلك فھو ضامن [1]

جو شخص پہلے سے علاج میں مہارت حاصل کئے بغیر کسی کا علاج کر دے اور اس کو نقصان پہنچے تو اس سے تاوان لیا جائے گا۔

غالباً اسی ارشاد نبوی کو سامنے رکھ کر خلفاء نے معالجوں کی نگرانی کو بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حضرت عمرؓ اس پر اتنی سختی سے عمل کیا کرتے تھے کہ جو عامل یا حاکم غلاموں اور خادموں کی عیادت نہیں کرتا تھا اس کو معزول کر دیتے تھے [2]

اگر کوئی شخص کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جائے مثلاً جذام، دق وغیرہ تو اگر اس کی استطاعت ہے تو اسے گھر سے باہر رہ کر اسے علاج کرانا چاہیئے اگر اس کی جیب میں پیسہ نہیں تو حکومت اس کا خرچ برداشت کرے گی اور اس کو گھر سے باہر رہ کر علاج کی سہولت بہم پہنچائے گی۔

گھر سے باہر رہنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ اس لیے کہ اس مرض سے دوسرے نہ متاثر ہوں، امام ابن قیم نے یہ بات جذام یعنی کوڑھ کے سلسلہ میں لکھی ہے مگر اس پر دوسرے متعدی و مہلک امراض کو قیاس کیا جا سکتا ہے جذامی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

وان لم یکن لہ مال خرج من المنزل اذا لم یکن فیہ شیئ ینفق علیہ من بیت المال۔

اسی طرح تعلیم کے سلسلہ میں قرآن کی ہدائتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خلفائے راشدین کے اسوے سامنے ہوں تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں ایک خاص ضرورت تعلیم بھی ہے آپؐ نے علم کے حصول کو ایک فرض قرار دیا ہے۔

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم [3] علم کی طلب ہر مسلمان مرد پر فرض ہے (مسلم شریف)

آپ نے صحابہ کو تعلیم کے لیے متعدد مقامات پر روانہ فرمایا تھا۔ خلفائے راشدین

---

[1] اس کو حاکم نے مستدرک میں اور دار قطنی اور نسائی نے اپنی اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے بھی اس روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے مگر اس کی صحت کے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔

[2] معاشی نظریے۔ جلد ۲: ص ۳۸۶۔

[3] عام طور پر اس میں مسلمۃ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ حدیث میں صرف لفظ مُسلِم ہے جس میں مرد اور عورت دونوں داخل ہیں۔

نے تعلیم کو حکومت کی ایک ذمہ دار قرار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود بیت المال سے انہوں نے اس کا انتظام کیا تھا۔ صرف مدینہ کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ۔

ثلثة فی المدینة یعلمون الصبیان وکان عمر بن الخطاب یرزق کل احد منهو خمسة عشر درهما فی کل شهر ۔ لہ

تین آدمی مدینہ میں بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور حضرت عمرؓ نے پندرہ درہم ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اسلامی نظام اجرت میں مزدوروں کو اتنی اجرت بہر حال ملنی چاہیئے جس کے ذریعہ وہ محض اپنے جسم وجان کا رشتہ ہی نہ قائم کر سکیں بلکہ اس کے ذریعہ (۱) غذا (۲) لباس (۳) مکان (۴) علاج (۵) اور تعلیم کا انتظام بھی کر سکیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، مزدوروں کو ایک متوازن اُجرت صحیحہ اسی وقت مل سکتی ہے جب ملک کی عام معاشی حالت میں ٹھہراؤ اور اس کی صنعت و تجارت میں توازن ہو۔ اگر یہ چیز نہیں ہوگی تو پھر اجرت صحیحہ میں پائیداری نہیں پیدا ہو سکتی۔ اور مزدوروں میں لامحالہ بے چینی پیدا ہوگی۔ اسی طرح اوپر اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ اگر مزدوروں کی اجرت صحیحہ کی مقدار میں برابر اضافہ ہوتا رہے اور وہ تعیشات میں مبتلا ہو جائیں تو بھی کارکردگی پر اس کا اثر پڑے گا جس سے ملک کی صنعت و تجارت اور معاشرت سب کو نقصان پہنچے گا۔

اسلام نے اجرت صحیحہ کو قائم رکھنے اور لوگوں کو تعیشات سے بچانے کے لیے جو تدابیر اختیار کی ہیں وہ اخلاقی بھی ہیں اور قانونی بھی۔ وہ ایک طرف انسانوں میں خوف خدا اور خوف آخرت کے ذریعہ ایسی اخلاقی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے

لہ کنزالعمال: جلد ۲: ص ۱۹۲

کہ ان میں مفاد پرستی، نفع اندوزی، خود غرضی اور ہوا و ہوس کے بجائے اخوت و ہمدردی اور قناعت پسندی کے جذبات پیدا ہوں۔ دوسری طرف ملک کے اندر ایک معتدل نظام حکومت قائم کر کے دولت کی غلط تقسیم کو مٹاتا ہے۔ اور قانوناً ایسے تمام ذرائع معاش بند کر دیتا ہے جس سے انسانی اخلاق اور معاشرت پر برا اثر پڑتا ہو۔ مثلاً: ذخیرہ اندوزی Hoarding، سٹہ بازی Speculation اور مضر صحت لہو ولعب، دولت کا بے جا صرف اور آجروں میں وہ ایسی ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اجیروں پر ظلم و ستم اور حق تلفی کرنے کے بجائے ان کو اپنے جیسا انسان سمجھ کر ان سے معاہدہ کرتے وقت یہ کہیں۔

وَمَا أُرِيْدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ [1]

میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی زیادتی ہو۔ اس سلسلہ میں تم انشاء اللہ مجھے اچھا آدمی پاؤ گے۔

ان کے دلوں میں خدا کا اور آخرت کا خوف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں جن تین آدمیوں کے خلاف خود مدعی ہوں گا ان میں۔

رجل استأجر اجیرا و استوفی منہ ولم یعط أجرہ [2]

ایک وہ شخص ہے جس نے کوئی مزدور رکھا اور اس مزدور نے اس کا کام پورا کر لیا مگر اس نے اس کی اجرت (بالکل) نہیں دی (یا پوری نہ دی)

ان کے سامنے ان ظالم آجروں کے بجائے جو مزدوروں کی اجرت مارنے

کی فکر میں لگے رہتے ہیں ان آجیروں کی مثالیں سامنے ہوں گی جو اجرت کے امین ہوتے ہیں۔ آپ نے ایک بار فرمایا کہ

"تین آدمی ایک غار میں پھنس گئے تھے۔ ان تینوں نے اپنے اپنے نیک کاموں کا واسطہ دے کر اس مصیبت سے نجات کی دعا کی تیسرا شخص جس کی دعا کے بعد یہ لوگ اس مصیبت سے نجات پاگئے وہ ایک آجیر تھا جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا تھا اور اتفاق سے وہ مزدور کام پورا کرنے کے بعد اپنی اجرت لیے بغیر چلا گیا اس آجیر نے اس کی اجرت کو ہڑپ کر جانے کے بجائے تجارت میں لگا دیا۔ اور اس میں اس کو کافی نفع ہوا۔ بہت دنوں کے بعد جب وہ مزدور واپس آیا اور اس نے اپنی اجرت طلب کی تو آجیر نے کہا کہ یہ تمام جانور اور مال و اسباب جو نظر آرہا ہے وہ سب تمہاری اجرت ہی کا ہے تو وہ اس کو مذاق سمجھا۔ مگر جب اس نے اس کو یقین دلایا تو وہ یہ سارا سامان لے کر گھر واپس آگیا[1]۔"

اسلام ان کارکنوں اور مالکوں کو جو مزدوروں، اجیروں اور ملازموں پر زیادتی کرتے ہیں یہ وعید سناتا ہے۔

لا یدخل الجنۃ سیئ الملکۃ۔

اپنے ماتحتوں سے برا برتاؤ کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔

آپ نے اپنی آخری وصیت میں یہ فرمایا کہ:

اتقوا اللہ فیما ملکت ایمانکم

اللہ نے جن کو تمہاری ماتحتی میں دیا ہے ان کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

مقصد یہ ہے کہ ان کے حقوق کا پورا خیال رکھو۔ گو یہ حدیث غلاموں

---

[1] مشکوٰۃ : ۴۲۱ طبع کراچی

اور ذاتی ملازموں کے بارے میں وارد ہوئی ہے مگر اس کے باوجود اس کے مفہوم مدلول کی عمومیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ تورپشتیؒ نے اس حدیث کے تحت ان محنت کش جانوروں کو بھی داخل کیا ہے جن سے آدمی کام لیتا ہے۔ اس لیے اس عمومیت میں مزدور اور اجیر بدرجۂ اولیٰ شامل ہوں گے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے کہ اس وقت اجرت پر کام کرنے والا پیشہ ور مظلوم طبقہ یہی تھا اس لیے آپ نے بار بار اس طبقہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔

وہ مزدوروں اور اجیروں کے ذہن میں بھی یہ بات بٹھاتا ہے کہ انہوں نے آجر سے معاہدہ کر کے جو کام اپنے ذمہ لیا ہے اس کی تکمیل محض مفاد پرستی، نفع اندوزی اور خود غرضی کے جذبہ سے نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ معاہدہ کے بعد ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لیے "القوی الامین" حیثیت اور دیانت دار ثابت ہوں اور یہ سمجھ کر کام کریں کہ یہ معاہدہ انہوں نے محض آجر سے نہیں بلکہ خدا سے کیا ہے۔ جو معاہدہ شکنی یا اس میں بددیانتی کو اخلاقی اور قانونی دونوں طرح کا جرم قرار دیتا ہے۔ معاہدہ کرتے وقت تم کو یہ سوچ کر معاہدہ کرنا چاہیے کہ:

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ [1]

جو کچھ ہم (معاہدہ میں) طے کر رہے ہیں خدا اس کا نگران ہے۔

اس لیے اگر ہم آجر کی نگاہوں اور اس کی نگرانی سے بچ گئے تو خدا کی نظروں سے نہ بچ سکیں گے۔ وہ صنعت کاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایسا سامان نہ بنائیں جن سے ان کو تو فائدہ ہو مگر انسانی زندگی کے لیے مفید نہ ہو۔ ان کے سامنے یہ اصول پیش کرتا ہے کہ:

من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ۔

آدمی کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بے ضرورت کام چھوڑ دے۔

---

[1] القصص: ۲۸

سٹہ بازوں اور ذخیرہ اندوزوں کو یہ وعید سناتا ہے۔

المحتکر ملعون۔

ذخیرہ اندوز ملعون ہے۔

من غش فلیس منا۔

جو کاروبار میں ملاوٹ کرتا ہے مسلمان نہیں ہے۔

وہ دولت پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے مگر مسرفانہ اور عیش پرستانہ زندگی بسر کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیتا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ۔ (بنی اسرائیل: ۲۷)

جو عیش و عشرت کی مسرفانہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔ اس کے بجائے وہ ایک خدا پرست کی صفت یہ بتاتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا [1]

جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں۔ ان دونوں کے بیچ میں ایک درمیانہ راستہ ہے۔

مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اسلام نے محض ان اخلاقی تعلیمات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لیے قانون بھی بنایا ہے۔ اس کی تفصیل حکومت کے فرائض کے سلسلہ میں آئے گی۔

غرض یہ کہ اسلام اس طریقہ سے اجیر و مستاجر کی کش مکش کو ختم کرتا ہے۔ اشیاء کی قیمتوں میں یکسانی پیدا کرتا ہے۔ اجرت صحیحہ کے معیار میں زیادتی اور مسرفانہ تعیشات کو مٹا کر ایک سادہ اور معتدل زندگی کو رواج دیتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام مطلق زیب و زینت اور سامان تفریح کو پسند نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس کو اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتا جو ملک کی

---

[1] الفرقان - ۶۷

معاش، اخلاق اور صحت پر اثر انداز ہو۔ ورنہ اعتدال و سلامت روی کے ساتھ زیب و زینت اور زیبائش و آرائش کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے۔

"اگر اللہ نے تمہیں کوئی نعمت دی ہے تو اس کا اثر تمہارے اوپر ظاہر ہونا چاہیئے"۔ مگر "لا تسرفوا" کی قید کے ساتھ یعنی ایسی زیب و زینت جس میں اسراف، دکھاوا اور غیر معتدل تعیش نہ ہو۔

معیارِ زندگی کی بحث

اس تفصیل کے بعد اس چیز کے بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ مزدوروں کی اجرت صحیحہ کی مقدار اور ان کا معیار زندگی کیا اور کیسا ہو؟ اسلام نے کچھ حدود مقرر کر دیے ہیں اور ان حدود کے اندر اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی جتنا چاہیں اونچا کریں۔ وہ جو قانون بھی بناتا ہے اس میں یکسانیت ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے معیار زندگی کیا ہونا چاہیئے اس سلسلہ میں ہم مشہور عالم معاشیات پروفیسر الیاس برنی صاحب کی رائے یہاں نقل کرتے ہیں۔

"اس مسئلہ میں ازحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے زندگی کا کونسا معیار بہتر ہے۔ آیا ہم کو چند سیدھی سادی ضروریات پر قناعت کرنا اچھا ہوگا یا دنیا کی نعمتوں اور تعیشات سے دل بھر کر لطف اٹھانا۔ حکمار کے ایک طبقہ نے تو نفس پروری اور عشرت پرستی کو زندگی کی غرض و غایت قرار دیا ہے۔ اور دوسرے نے نفس کشی اور ریاضت کو اعلیٰ مقصد[1] ٹھہرایا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ فرقے افراط و تفریط میں جا پھنسے ہیں۔ خدا کے بے شمار عطیات سے بے نیاز و دست کش رہنا بھی کفرانِ نعمت

---

[1] موجودہ دنیا میں اس مقصد کے ماننے والے بہت محدود تعداد میں رہ گئے ہیں اس وقت دنیا کی ۹۹ فیصد آبادی تن پروری ہی کو اعلیٰ ترین مقصد بنائے ہوئے ہے۔ اور اس کی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

ہے اور تمام عمر تن پروری کی نذر کر دینا بھی گمراہی ہے۔

دنیا کی لذتوں کا اعتدال سے لطف اٹھانا پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار ہے لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق یہی ہے اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو اسی طریق کی ہدایت کی ہے۔ مذہبی اور اخلاقی پہلو سے قطع نظر کر کے یہی طریق اعتدال معاشی نقطۂ نظر سے اصولاً و تجربۃً بہترین ثابت ہو رہا ہے[۱]"

موجودہ معاشیات کی بیماری

موجودہ علمائے معاشیات نے جن معاشی مسائل کو خواہ مخواہ چیستان بنا دیا ہے ان میں ایک معیار زندگی اور اس سے اجرت کا تعلق بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے فکر کی بنیاد مفروضات پر رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی بنیادی غلطیاں یہ ہیں۔

۱- وہ معیار زندگی کا ایک فرضی نقشہ اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ یا پھر ایک مصنوعی معیار زندگی کو جسے وہ اپنے حظ نفس کے تحت بڑھاتے رہتے ہیں۔ معیار بنا کر مزدوروں کی اجرت کی تعیین اور اس کے اضافہ پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ مگر جس چیز پر انہوں نے اس کی بنیاد رکھی ہے وہ چونکہ فرضی اور غیر حقیقی ہے۔ اس لیے ان کے سارے نتائج فکر یا تو محض فلسفہ ہو کر رہ جاتے ہیں جن کو زندگی کے عملی اور تجرباتی پہلو سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا یا پھر ایک مصنوعی معیار زندگی وجود میں آجاتا ہے۔ جس سے دوسری معاشی اور معاشرتی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن کا اعتراف خود ان کو بھی ہے۔ حالانکہ اس بارے میں فرضی اور مصنوعی معیار زندگی کے بجائے وہ انسان کی واقعی اور حقیقی ضرورتوں کو بنیاد بناتے تو ان کے لیے اس کا فیصلہ کرنا بھی آسان

---

[۱] الیاس برنی علم المعیشت : باب تعریف دولت : ص ۴۷

ہو جاتا اور ان الجھنوں سے بھی نجات پا جاتے جن میں وہ اس وقت مبتلا ہیں

۲- معیارِ زندگی کے بارے میں ان کا یہ تصور رہے کہ وہ مستقل بالذات اور براہ راست زندگی کو خوشحال بنانے والی چیز ہے۔ حالانکہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ معیارِ زندگی بسا اوقات زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے بجائے بگاڑنے کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسا کہ مزدوروں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اگر ان کا معیارِ زندگی بہت بڑھ گیا تو تعیشات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ چیز کارکردگی پر اثر انداز ہو گی جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔

اگر وہ معیارِ زندگی کو مؤثر بالذات سمجھنے کے بجائے اس کو اضافی چیز سمجھتے اور اس کی تعیین ضرورت اور حاجت کے تحت مقرر کرتے تو ان کی رائے میں یہ تضاد پیدا نہ ہوتا۔ مگر یہ لوگ انسانی اخلاق کو تو آسانی سے اضافی قرار دے سکتے ہیں، مگر پیٹ کے کسی مسئلہ کو اضافی قرار نہیں دے سکتے۔ خواہ اس سے کتنا ہی اُلجھاؤ پیدا ہو جائے۔

مسٹر ٹاسگ بھی اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ مگر ان کے سامنے کوئی دوسرا واضح نقشہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ لکھ کر اپنا فرض پورا کر دیتے ہیں کہ:

"وہ بھی (یعنی علماءِ معاشیات) اس مغالطہ میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے معیارِ زندگی پر اس طرح سے بحث کی ہے، گویا وہ براہ راست اثر ڈالنے والا عامل ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ محض بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے"[1]

اس غلطی کا اثر موجودہ دور کے مزدوروں کے ایک بڑے طبقہ پر بھی پڑا ہے، وہ سمجھنے لگے ہیں کہ معیارِ زندگی کی بلندی ہی پر ان کی اجرت کی زیادتی اور خوشحالی کا دارو مدار ہے، ارزاں اور اوسط درجہ کی زندگی ان کے لیے مضر اور نقصان دہ

---

[1] مسٹر ٹاسگ اصول معاشیات: ج ۲: ص ۳۴۲

ہے، حالانکہ یہ خیال ایک شدید مغالطہ ہے، اس بارے میں مزدوروں کے ہمدرد اور وکیل مسٹر ٹاسگ لکھتے ہیں:

"معیار زندگی کے بارے میں عجیب وغریب مغالطے ہیں، اوپر کے طبقہ کے مزدوروں میں یہ خیال عام طور سے پایا جاتا ہے کہ ارزاں طرز بود باش ان کے لیے مضر ہے، اور شاہ خرچ ہونا مفید ہے، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر وہ کفایت شعاری سے کام لیں مثلاً ارزاں غذا استعمال کریں تو وہ کارآمد نہ رہیں گے اور ان کی اجرت میں کمی ہو جائے گی، اس کے برخلاف اگر وہ خوشحالی کے ساتھ بسر کریں تو ان کی اعلیٰ اجرت قائم رہے گی اس وجہ سے ایسے اشخاص ان کے متعلق جو یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اشیائے خورد و نوش اور استعمال کرنے کے طریقوں میں کفایت ہونی چاہیے، یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ان کی اجرت کم کرنے کی سازش میں پوشیدہ طور سے ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ خام خیالی اور غیر معقول بات اور کچھ نہیں ہو سکتی اگر آمدنی سے حتی الامکان زیادہ افادہ حاصل ہو تو اس سے ان قوتوں کا زور بڑھ جاتا ہے، جن پر خوشحالی کی اساس قائم ہے[1]

اوپر اسلامی معیار اجرت کی جو تفصیل کی گئی ہے اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں جو موجودہ دور کے مروجہ نظام اجرت میں پائی جاتی ہیں جس کی طرف مسٹر ٹاسگ نے بھی اشارہ کیا ہے اسلام نے فرضی یا مصنوعی معیار زندگی اور محض حظ نفس کے بجائے انسان کی بنیادی ضرورتوں کے پیش نظر معیار زندگی مقرر کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کے کچھ حدود مقرر کر دیئے ہیں جو نہ صرف مزدوروں بلکہ تمام باشندگان ملک کے لیے یکساں ہیں، اس نے کسی

---

[1] مسٹر ٹاسگ اصول معاشیات: ج ۲: ص ۲۳۲

رائج معیار زندگی کو مؤثر بالذات اور مزدوروں کی اجرت کا معیار نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو ایک اضافی چیز قرار دیا ہے، اس بنا پر جب وہ مزدوروں کو کفایت شعاری کی ترغیب دیتا ہے تو ان کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ان کی اجرت میں کمی کی سازش کی جا رہی ہے، کیونکہ یہ مطالبہ سارے ملک سے ہوگا، اور ان کو خواہ مخواہ ایک مصنوعی معیار زندگی کی طرف لپکنے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز طریقے اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اس لیے کہ دولت میں کمی اور زیادتی کے باوجود نہ تو ان کی معاشی ضرورت رُکے گی اور نہ معاشرتی اور نہ سیاسی اعتبار سے ان کی کوئی حق تلفی ہوگی۔

اوقات کار کی تحدید

اجرت کی تعیین کی طرح اوقات کار کی تحدید کا تعلق بھی اجیر و مستاجر کی رضامندی اور معاہدہ سے ہے۔ اس بارے میں اسلام کوئی جبری طریقہ اختیار نہیں کرتا بلکہ مستاجر کے اخلاق اور جذبۂ ہمدردی کو ابھارتا ہے۔ اور اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اجیر کو اپنا بھائی اور اپنے جیسا انسان سمجھے اور ان سے ان کی قوت اور صلاحیت سے زیادہ کام نہ لے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مستاجر سے اس بارے میں محض اپیل کر کے اجیر کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور قانونی کارروائی نہیں کرتا۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ خارجی اور قانونی دباؤ سے پہلے انسان کے ضمیر اور قلب کی رغبت کے ذریعہ سے کام کرانا چاہتا ہے۔ جب اس داخلی قوت سے کام نہیں چلتا تب خارجی دباؤ ڈالتا اور قانون کا استعمال کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ولا تکلفوھم من العمل ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم[1]

ان سے ایسا کام نہ لو جو ان کو بالکل چُور کر دے اگر ان سے کوئی سخت کام لینا ہی ہے تو خود بھی ان کی اعانت کرو۔

---

[1] الادب المفرد

حضرت عمرؓ نے کارکنان حکومت کو جو عام ہدائتیں دی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ۔

"ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ جب وہ تھک جائیں تو رُک جاؤ[1]"

صحابہ کرامؓ اپنے ملازموں بلکہ اپنے جانوروں سے بھی سخت کام نہیں لیتے تھے۔ ایک شخص حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس آیا۔ دیکھا کہ بیٹھے ہوئے آٹا گوندھ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ملازم کہاں ہیں؟ بولے ہم نے اس کو ایک کام کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے میں نے پسند نہیں کیا کہ بیک وقت اس سے دو دو کام لوں۔

حضرت عثمانؓ رات کو اٹھ کر خود وضو وغیرہ کا پانی لے لیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ یہ کام کسی سے لے لیا کریں۔ تو آپؓ نے فرمایا "رات ان کے آرام کے لیے ہے"۔

مختصر یہ کہ اسلام نے اوقات کار کی کوئی خاص تحدید نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کو اجیر و مستاجر کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے مگر یہ شرط لگا دی ہے کہ ان سے بہر حال اتنا کام نہ لیا جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ یا یہ کہ ان کی صحت پر اس کا برا اثر ڈالے۔ اسی اصول کے تحت اگر حکومت یہ دیکھے گی کہ اس سلسلہ میں مزدوروں پر کس طرح کی زیادتی ہو رہی ہے تو وقت کی تحدید کا قانون بنا دینے کی وہ مجاز ہوگی۔

---

[1] امام ابو یوسف: کتاب الخراج ص۶ یہ حکم انہوں نے جنگ کے موقع پر دیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ جنگ ایک ہنگامی ضرورت ہے اس میں غیر معمولی طور پر کام کرنا ضروری ہوتا ہے جب ایسے وقت میں اس کا لحاظ کیا گیا تو پھر دوسرے کاموں میں خاص طور سے اجیروں کے ساتھ اس کا لحاظ ضروری ہوگا

تعطیل: ان کی آسائش و آرام کے سلسلہ میں ایک سوال ان کی چھٹی کا بھی آتا ہے اس سلسلہ میں اسلامی قانون اجرت میں اس کی گنجائش ہے کہ ہفتہ میں ایک دن اور سال کے ان دنوں میں ان کو چھٹی دی جائے جو کسی مسلمان یا غیر مسلم اجیر کے لیے مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں میں جمعہ کا دن زیادہ مقدس سمجھا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں اتوار کا اور یہودیوں میں سنیچر کا۔ ہندؤں کے یہاں منگل وغیرہ۔ اس لیے اگر مختلف عقیدہ کے اجیر چاہیں کہ ان کو اس دن چھٹی دی جائے تو ان کا حق مستاجر اور حکومت کو ماننا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں عاجز کو کوئی فقہی جزیہ نہیں مل سکا مگر جامعہ ازہر کے ایک عالم نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی فقہ میں اس کی گنجائش ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے۔

ففی الفقہ الاسلامی لو استاجر رجل یہودیا شہرا کاملا کان السبت مستثناۃ من العمل [1]

اسلامی فقہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی یہودی کو ایک مہینہ کامل بطور مزدور کے رکھے تو سنیچر کا دن کام سے مستثنیٰ ہوگا، خواہ اس کا ذکر معاہدہ میں ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اس پر ہر اجیر کو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، قیاس کرنا چاہیئے اس اخلاقی ذہنیت کی موجودگی معاہدہ، اجرت کی آزادی اور قانون کی پشت پناہی کے بعد اس شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ مستاجر مزدوروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان سے زیادہ کام لے سکتا ہے۔ یا کچھ کام بغیر اجرت بھی کرا سکتا ہے

اجیروں کی توہین اور ان کو سزا: مزدوروں اور عام اجیروں کی بے دلی اور بے چینی کا ایک خاص سبب ان کی توہین اور ان کی سزا بھی ہے۔ اوپر چین میں مزدوروں کے قوانین کی تشریح کے سلسلہ میں ان کی بھاری بھاری سزاؤں کا ذکر بھی آیا ہے۔ دوسرے ممالک

---

[1] الحکم ربیع الاول ۱۳۷۸ھ

میں بھی مزدوروں کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں جیل کی سزاؤں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۵ء میں کانپور میں اسٹرائیک ہوئی۔ اس میں ہزاروں مزدوروں کو جیل میں بند کر دیا گیا مگر ایک بھی مل مالک کو سزا نہیں دی گئی۔ ۵ ستمبر ۱۹۵۵ء کو اڑیسہ میں مارشل کے مقام پر ایک سرکاری مینگنیز کی کان کے مزدوروں پر پولیس نے ۸ راؤنڈ گولیاں چلائیں[1] مگر ایک افسر کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔

آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا اجیروں اور مستاجروں کے جھگڑے میں ہمیشہ قصور اجیروں کا ہی ہوتا ہے۔ اجیر اگر اسٹرائیک کر کے ملک کی صنعت کو نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ مجرم قرار پاتے ہیں۔ لیکن اگر کارخانہ دار جو اپنی مفاد پرستی کے لیے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ مزدور ہڑتال پر مجبور ہوں تو وہ مجرم کیوں نہیں؟ اسی طرح توہین کا مسئلہ بھی ہے۔ اس زمانہ میں گو کارخانوں کے مزدوروں کے ساتھ اس قسم کا معاملہ نہیں کیا جاتا مگر ذاتی اور خانگی ملازموں اور چھوٹے کام کرنے والوں کے ساتھ عام طور پر توہین آمیز سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کارخانے اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے اجیروں کی سماجی قسم کی توہین ذہن میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ موجودہ سوسائٹی میں کسی فرد یا جماعت کا محنت کش اور مزدور پیشہ ہونا ہی ان کو سماج میں گرا دیتا ہے اور وہ سماج کے بہت سے اضافی اعزازات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ عام رویہ یہی ہے اگرچہ اس میں کچھ استثنائی مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔

توہین اور ذلت کو خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو اور کسی طرح کی ہو، اسلام پسند نہیں کرتا اور اس سے روکتا ہے۔ وہ مزدوروں کی معاشی مساوات سے زیادہ معاشی

---

[1] قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۵۵ء۔

انصاف پر زور دیتا ہے البتہ معاشرت و اخلاق میں مساوات کی پوری تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مزدوروں اور ملازموں کو خادم نہیں بلکہ بھائی (اخوانکم) قرار دیتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی آقا اپنے غلام کو غلامی، میرا غلام نہ کہے۔ بلکہ فتائی، میرا جوان کہے۔ اسی طرح غلاموں کو ممانعت ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب (پالنے والا) نہ کہیں بلکہ مولیٰ (کفیل) کہیں۔

اسی طرح سزاؤں کے معاملہ میں اس نے اجیر و مستاجر کی حیثیت یکساں رکھی ہے اور دونوں کو معاہد قرار دیا ہے۔ اس لیے جس کی طرف سے معاہدہ شکنی ہو گی اس کو سزا دی جائے گی مگر حکومت یہ ملحوظ رکھے گی کہ خود معاہدہ تو ایسا نہیں ہے جس میں مزدوروں کو معاشی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی اجرت ہضم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ اگر خود معاہدہ ہی میں اختلاف موجود ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ اختلاف کام کی نوعیت میں ہے یا اجرت میں۔ اگر کام کی نوعیت میں ہو گا تو مستاجر کی بات مانی جائے گی اور اجیر کی زیادتی تصور کی جائے گی۔ اور اگر اجرت کے بارے میں اختلاف ہو گا تو اجیر کی بات مانی جائے گی اور مستاجر کی زیادتی سمجھی جائے گی۔ اس لیے کہ پہلی صورت میں استحقاق مستاجر کے ساتھ تھا اور دوسری صورت میں اجیر کے ساتھ[1] اسی لحاظ سے جس کی زیادتی ہو گی وہ سزا پائے گا۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے ہدایہ باب الاختلاف اور بدائع وصنائع ج ۵ باب اجارہ ص ۲۲۲۔ اس بارے میں کچھ ہلکا سا اختلاف ہے۔ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں عرف و عادت کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ اجیر عام طور پر کام میں بددیانتی کرتا ہے اس لیے اس بارے میں مستاجر کی بات مانی جائے گی۔ اور اجرت کے بارے میں مستاجر بددیانتی کرتا ہے اس لیے اس بارے میں اجیر کی بات مانی جائے گی۔

باب ہفتم

ہنگامی ضرورتوں میں مزدوروں کی کفالت

ان ضرورتوں کے علاوہ مزدوروں کی کچھ ہنگامی ضرورتیں بھی ہیں، جن کی تکمیل کے بغیر کوئی قانون اجرت (Law of Wages) مکمل نہیں کہا جا سکتا مثلاً (۱) جسمانی نقصان کی تلافی (۲) از کار رفتہ ہونے کی صورت میں گذر اوقات کا سامان (۳) ہنگامی ضرورتوں کے لیے بلا سودی قرضہ کا انتظام وغیرہ۔

ان ضرورتوں اور حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے جو تدبیریں اختیار کی ہیں وہ تین قسم کی ہیں۔ ایک جس کا تعلق پورے معاشرے سے ہے، دوسری جس کا تعلق اجیروں سے ہے، اور تیسری جس کا تعلق حکومت سے ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اسلام معاشرہ کے عام افراد کے ذہن نشین کراتا ہے، کہ انسان خواہ کتنا ہی صاحب دولت و ثروت اور بے نیاز کیوں نہ ہو، زندگی میں کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑ جاتی ہے، کہ اس کو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، اور دوسروں سے مدد لینی پڑتی ہے، اس لیے معاشرہ کے ہر فرد کو چاہیئے کہ وہ اپنے مصیبت زدہ بھائی کی اعانت و دست گیری کرے، اپنی مطمئن حالت پر مغرور ہو کر اہل حاجت کی حاجت روائی سے بے پروانہ ہو جائے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی دوسروں کی مدد کی ضرورت نہ پڑے گی، اس بارہ میں بہت سی آیات و احادیث ہیں، جن کی پوری تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے پھر بھی ان کی روشنی میں چند باتیں پیش کر دی جاتی ہیں، اہل ضرورت کی امداد کرنے کے

سلسلہ میں قرآن نے پانچ لفظ استعمال کئے ہیں سائل، محروم، غارم، مسکین اور فقیر، عام طور پر ان الفاظ کے بہت محدود معنی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً سائل کے معنی "بھک مانگے" محروم کے معنی "غنیمت یا دولت سے محروم" اور غارم کے معنی "جن پر قرض کا بار ہو" اور فقیر و مسکین کے معنی غریب کے لیے جاتے ہیں، مگر محققین نے ان الفاظ کے معنی کو بہت زیادہ وسعت دی ہے، مثلاً:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ (الضحیٰ: ۱۰)

سائل کو جھڑکو نہیں،

میں سائل کی تشریح مجاہدؒ نے یہ کی ہے کہ:

واما من سالك من ذی حاجة فلا تنهر۔

جو اہل حاجت تم سے کوئی مدد چاہے تم اس کو جھڑکو نہیں۔

شیخ حسن بصریؒ کا قول ہے، کہ سائل سے مراد طالب علم ہے،،

راغب نے تو سوال کے لفظ کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس میں انسان کی ہر ضرورت اور حاجت کو داخل کر دیا ہے (مفردات القرآن)

اسی طرح محروم کے لفظ کی تشریح میں صاحب لسان ابن منظور لکھتے ہیں[1]

۱۔ من لا ینمی لہ المال۔

وہ شخص جو محنت کرتا ہے مگر اس کی آمدنی میں اضافہ نہ ہوتا ہو،

۲۔ المحارف الذی لا یکاد یکتسب لہ

وہ مجبور محنت کش جو اپنی ضروریات پوری نہ کر پاتا ہو، یا پوری کرنے کے قابل نہ ہو۔

اسی طرح امام راغبؒ لکھتے ہیں۔

---

[1] ابن منظور الافریقی: لسان العرب: لفظ حرم

المحروم ای لم یوسع علیہ الرزق۔

محروم وہ شخص ہے جس کی روزی میں وسعت نہ ہو،

اس وجہ سے کتے کو بھی محروم کہہ دیا کرتے ہیں، کہ اس کو لوگ روزی سے محروم رکھتے ہیں،

تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد وغیرہ سے محروم کے لفظ کی تشریح محارف کے لفظ سے منقول ہے، یعنی محروم سے مراد وہ شخص ہے، جو روزی کمانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ تنگ دست ہے[1]

غارم کے لفظ کی تفسیر کے سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول[2] اوپر گذر چکا ہے مجاہدؒ اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

من احترق بیتہ او یصیبہ السیل فیذھب متاعہ ویدان علی عیالہ[3]۔

جس کا مکان جل گیا ہو، یا اس کو سیلاب سے نقصان پہنچا ہو، اور اس کو بال بچوں کی پرورش کے لیے قرض لینے کی ضرورت ہو۔

فقیر و مسکین کی تفسیر عموماً یہ کی جاتی ہے، کہ فقیر وہ شخص ہے، جو تنگ دست ہو، مگر اپنی ضرورت کا کسی سے اظہار نہ کرتا ہو، اور مسکین جو اپنی ضرورت کا اظہار کر دیتا ہے۔[4]

---

[1] سورۃ معارج تفسیر وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم۔

[2] اگر بنیادی ضرورتوں کا سامان اس کے پاس موجود ہو، مثلاً مکان، غلّہ، جائداد۔ پھر بھی اگر قرضدار ہو جائے، یا قرض مانگے تو اس کو حکومت کی طرف سے دیا جائے گا۔

[3] تفسیر طبری سورۃ توبہ آیات انما الصدقات۔

[4] ایضاً

حضرت عمرؓ نے ان الفاظ کو اور وسعت دی ہے، انہوں نے فرمایا کہ وہ شخص جو کماتا ہو، مگر اس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں، اور پھٹے حال رہتا ہو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک فرمان میں لکھا تھا، کہ:

دو مسکین دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ لوگ جو کسی افتاد یا مجبوری کی بنا پر اپنی ضرورت پوری نہ کر سکتے ہوں، مگر کسی سے کچھ کہتے نہ ہوں، دوسرے وہ لوگ جو اپنی مجبوری اور ضرورت کا اظہار کرتے ہوں، ان دونوں قسم کے لوگوں کو زکوٰۃ فنڈ سے مدد دینی چاہیے [۱]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کو اور بھی وسعت دی ہے" وہ فرماتے ہیں:

۱۔ الفقراء الذین لا حرفۃ لہم۔

ضرورت مند دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو سرے سے بے روزگار ہوں،

۲۔ واہل المحرف الذی لا تقع حرفتہم من حاجتہم موقعا۔

دوسرے وہ لوگ جن کا ذریعہ معاش تو ہے، لیکن معقول نہیں ہے، کہ جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

والمساکین السؤال من لہ حرفۃ تقع موقعا ولا تغنیہ وعیالہ [۲]۔

اور مساکین وہ لوگ ہیں جن کے پاس ذریعہ معاش تو ہے، مگر اس سے

---

[۱] ابو عبید کتاب الاموال: ص ۲۷۹۔

[۲] علامہ زبیدی: تاج العروس ص لفظ فقیر۔

ان کے اہل وعیال کی کفالت نہیں ہو پاتی، اس لیے وہ مدد کے خواستگار ہوتے ہیں،

اسی طرح قرآن کے بعض اور الفاظ مثلاً بائس، قانع، اور معتر وغیرہ کی تفسیر سے بھی اس سلسلہ میں کافی رہنمائی ہوتی ہے،

اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی کثرت سے ملتے ہیں چند، ملاحظہ ہوں،

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ[1]

جو اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا۔

آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیواؤں، غریبوں، اور اہل حاجت کی دیکھ بھال کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے[2]،

ایک بار فرمایا کہ خدا کی مخلوق اللہ کی عیال ہے، خدا کے یہاں سب سے اچھا شخص وہ ہے، جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے[3]۔

خود حضور کا اسوہ یہ تھا، کہ جب کوئی سائل یا حاجت مند آجاتا۔ تو آپ فرماتے کہ تم میرے پاس ان کی سفارش کر دیا کرو، تم کو اجر ملے گا۔ تشفعوا توجروا۔ مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے کہ وہ آنے میں جھجک محسوس کرے، یا اپنی ضرورت نہ بیان کر سکے، اس لیے تم اس کی ضرورت کہہ دیا کرو، آپ نے یہ عام اعلان کر

---

[1] مشکوٰۃ: باب الرحمۃ علی الخلق۔

[2] ایضاً۔ [3] ایضاً۔

دیا تھا، کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو، میں اس کا وارث ہوں، جس کا کوئی کفیل نہ ہو، میں اس کا کفیل ہوں،

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے، کہ:

۱۔ معاشرہ کے ہر فرد کا یہ ایک اخلاقی فرض ہے، کہ وہ حاجت مندوں، غریبوں، اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرے۔

۲۔ حاجت مند اور اہل ضرورت صرف وہی لوگ نہیں ہیں، جو بالکل بے وسیلہ اور بے سہارا ہوں، بلکہ وہ لوگ بھی ہیں جو ذریعہ معاش رکھتے ہوئے بھی اہل وعیال کی کثرت اور اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے پریشان حال ہوں[1]، جیسا کہ عام طور پر متوسط طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں،

اگر کوئی شخص کسی ضرورت مند کی خود مدد نہ کر سکے، تو اس کا یہ فرض ہے، کہ اہل ثروت سے یا حکومت سے اس کی مدد کرانے کی کوشش کرے۔

ممکن ہے کہ اس سے کسی کو یہ خیال پیدا ہو، کہ اس تعلیم سے گداگری کو شہ ملے گی، اور لوگوں میں محنت کے بجائے دوسروں کے سہارے جینے کی ذہنیت پیدا ہوگی، اور یہ دونوں چیزیں انسانوں کی سیرت وکردار کے لیے مضر ہیں، مگر اوپر جو باتیں محنت کے سلسلہ میں کی گئی ہیں، اگر وہ ذہن میں رکھی جائیں، تو یہ شبہ جاتا رہے گا، اس کی مزید تفصیل یہاں پیش کی جاتی ہے

اسلام نے سوال کرنے اور مدد مانگنے کی اجازت ضرور دی ہے، مگر مجبوری کی حالت میں ورنہ گداگری اور کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور دوسروں

---

[1] ان اخراجات کی زیادتی کے ساتھ فقہاء نے یہ شرط لگا رکھی ہے، کہ ولا اسراف ولا تبذیر ولا فساد یعنی فضول خرچی، تعیش، اور معاشرہ میں کوئی فساد پیدا کرنے میں اخراجات نہ ہوئے ہوں،

کے سلسلے پر جینے کو سخت ناپسند کیا ہے، اور اس کو دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی قرار دیا ہے، چنانچہ قرآن مجید نے ان لوگوں کی توصیف کی ہے جو ضرورت مند ہوتے ہیں، مگر باوجود مفلسی اور ناداری کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں حیا محسوس کرتے ہیں، اور اگر ضرورت پیش آتی ہے، تو اس قدر تعفف یعنی شرم و حیا کے ساتھ سوال کرتے ہیں، کہ ان کی حاجت یا ضرورت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، اور ناواقف لوگ تو ان کو مالدار سمجھتے ہیں

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۔ [1]

ناواقف لوگ ان کی خودداری اور عدم سوال کے باعث ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف ان کے چہرے بشرے سے ان کی ضرورت کو جان سکتے ہو، وہ گڑگڑا کر یا کسی سے لپٹ کر کچھ نہیں مانگتے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار چند صحابہ سے بیعت لی، جن باتوں پر بیعت لی ان میں ایک یہ بھی تھی، کہ:

لا تسئلون الناس شیئاً [2]

لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگنا۔

ایک بار فرمایا جو شخص گداگری کو پیشہ بنا لیتا ہے، وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا، کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا [3]۔

---

[1] البقرہ: ۲۷۳

[2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ

[3] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سئل الناس تکثرا۔

آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم تم میں کسی کا رسی لے کر، لکڑی کاٹ کر اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے، کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے [۱]

اس تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابۂ کرام ابتدائی زمانہ میں اپنی انتہائی تنگ دستی اور ضرورت کے باوجود کسی سے سوال نہیں کرتے تھے، بعض لوگ یہاں تک احتیاط کرتے تھے، کہ اگر وہ اونٹنی پر سوار ہوتے، اور ان کا کوڑا اگر جاتا تو خود اتر کر کوڑا اٹھا لیتے، کسی دوسرے سے اٹھانے کے لیے نہ کہتے تھے، ان ہی لوگوں میں حضرت صدیقؓ بھی تھے [۲]، حالانکہ اس طرح کے سوال سے ان کو منع نہیں کیا گیا تھا ایک صحابی حکیم بن حزامؓ نے ایک بار آپ سے کچھ مانگا، آپ نے مرحمت فرمایا، انہوں نے پھر مانگا، آپ نے پھر عنایت کیا، تیسری مرتبہ سوال پر بھی آپ نے عنایت فرمایا، اور یہ نصیحت کی، کہ اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ ہے، مگر جو شخص اس کو خوش دلی، کشادہ دلی، اور شرافت نفس کے ساتھ لے گا، تو اس میں برکت ہوگی، اور جو لالچ کے ساتھ لے گا، اس کو برکت نہ ہوگی، اور اس کی حالت اس شخص کی سی ہوگی، جو کھاتا چلا جائے، مگر اس کا پیٹ نہ بھرے" اس نصیحت کے بعد ان کا یہ حال ہو گیا، کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ان کو ان کا وظیفہ دینے کے لیے بلایا جاتا، مگر وہ انکار کر دیتے تھے [۳]۔

ایک صحابی مالک بن سنانؓ کا حال یہ تھا، کہ ایک بار وہ تین دن تک بھوکے رہے مگر کسی سے کچھ مانگا نہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، تو فرمایا، کہ جس کو عفیف المسلم (سوال کرنے میں محتاط) شخص کو دیکھنا منظور ہو، تو وہ مالک بن سنان کو دیکھ لے، [۴]۔

---

[۱] بخاری شریف: کتاب الزکوٰۃ: باب من سئل الناس تکثرا [۲] مسند جلد اص۱ باب کراہیۃ المسئلہ

[۳] بخاری باب الاستعفاف

[۴] اسد الغابہ تذکرہ مالک بن سنان۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں، کہ اگر میں کسی نوجوان کو دیکھتا ہوں کہ وہ بیکار ہے، تو میری نظر سے گر جاتا ہے،

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ اسلام نے کس طرح گداگری کو مٹانے کی کوشش کی ہے، اور اس کو اس میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے مگر چونکہ انسان کی ضروریات کیلیے سوال ناگزیر ہے اس لیے اس نے شدید ضرورت کی حالت میں سوال اور امداد طلب کرنے کی اجازت دی ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کا بھی اہتمام کیا ہے، کہ حاجت مندوں اور ضرورت مندوں میں ذلت، تھڑی اور دنائیت و پستی نہ پیدا ہونے پائے، اور خود داری اور شرافت نفس برقرار رہے، اسی لیے مدد دینے والوں کو یہ تاکید ہے، کہ وہ یہ سمجھ کر نہ دیں کہ وہ سائل پر احسان کر رہے ہیں، بلکہ یہ تو سائل کا احسان ہے، کہ اس کی وجہ سے دینے والا خدا کے یہاں اجر کا مستحق ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ وہ خرچ کرے گا، وہ خدا کی راہ میں ہو گا، تو گویا اس نے اپنا ایک فرض ادا کیا، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار تاکید کی ہے۔

وَلَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ ﴿٩﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى۔ (البقرة: ۲)

اپنے صدقات کو احسان رکھ کر اور تکلیف پہنچا کر برباد نہ کرو، اچھی بات اس صدقہ سے زیادہ بہتر ہے جس میں کوئی تکلیف شامل ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مالی یا جانی امداد کی جائے اس میں نام و نمود کا جذبہ نہ ہو، بلکہ زیادہ سے زیادہ اخفا اور پوشیدگی ہو، یہاں تک کہ دائیں ہاتھ سے دیں تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو،

اسی طرح کھانا کپڑا یا مال و سباب میں سے جو چیز بھی کسی کو بطور مدد دی جائے، وہ خراب و خستہ سڑی گلی یا بیکار نہ ہو، بلکہ کرائم الاموال یعنی وہ بہتر سے بہتر ہو، ظاہر ہے کہ ان تدبیروں کے بعد یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا، کہ اسلام گداگری اور دوسروں کے سہارے جینے [illegible] ذلیل ذہنیت پیدا کرتا ہے

باب ہشتم

اہلِ پیشہ اجیروں کے حقوق

اب تک ان اجیروں، مزدوروں اور ملازموں کے حقوق کا تذکرہ کیا گیا، جو انفرادی کام کرتے ہیں یا وہ کسی کارخانہ وغیرہ میں محنت مزدوری کرتے ہیں، مگر اجیروں کی ایک قسم ان اہل پیشہ اور اہل ذمہ اجیروں کی ہے، جو کسی کی ملازمت یا کسی دوسرے کے کارخانہ میں بحیثیت اجیر کام نہیں کرتے، بلکہ وہ ذاتی طور پر اپنے گھر پہ اجرت پہ کام کرتے ہیں، وہ دوسروں کے پاس خود نہیں جاتے بلکہ خود ان کے پاس لوگ آتے ہیں، اور اجرت دے کر کام کراتے ہیں، مثلاً لوہار، سنار، درزی رنگریز، دھوبی وغیرہ، ہندو دھرم تو انہیں ناپاک تصور کرتا ہے، ان کے ساتھ کھانے کو چھوت اور وبال کھانے سے تشبیہ دیتا ہے، مگر اسلام ان کے بھی حقوق اور فرائض کی تعیین کرتا ہے، اور ان کو معاشرہ میں مساویانہ حیثیت عطا کرتا ہے،

اسلامی قانون اجرت میں پہلی قسم کے اجیروں کو اجیر خاص یا اجیر واحد اور دوسری قسم کے اجیروں کو اجیر مشترک کہا جاتا ہے، اجیر مشترک کے حقوق بھی قریب قریب وہی ہیں، جو اجیر خاص کے بیان کیے گئے ہیں، صرف چند باتوں میں دونوں کے احکام بدل جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

اجیر خاص مستاجر سے اجرت و محنت کا جو معاہدہ کرتا ہے، اس میں اجرت

اور وقت کی تعیین تو ضروری ہے، مگر کام کی پوری تفصیل اور اس کی نوعیت کی تصریح ضروری نہیں، مگر اجیر مشترک کے معاہدہ میں وقت کی تعیین ضروری نہیں ہے، بلکہ اس میں کام کی نوعیت اور قسم بتانا ضروری ہے، وقت کی تعیین اجیر کی مرضی پر ہے، مثلاً کارخانہ دار کو مزدور کی اجرت اور کام کا وقت متعین کرنا ضروری ہے، لیکن اگر کسی درزی کو کپڑا سینے یا کسی سنار کو زیور بنانے کے لیے دیا جائے، تو اس کا اور آپ کا منشا حق ہے۔ کہ آپ یہ طے کریں، کہ کپڑا کیسا اور کس قسم کا سیا جائے گا، قمیص ہوگی یا کرتہ یا پائجامہ ہوگا یا پتلون، اگر قمیص ہوگی تو اس میں کالر ہوگا یا سادہ، کرتا ہاتھ سے سیا جائے گا۔ یا مشین سے، پائجامہ بڑی مُہری کا ہوگا، یا چھوٹی وغیرہ وغیرہ، اسی طرح زیور کیسا اور کس نوعیت کا ہوگا، اس کی تعیین نمونہ دکھا کر یا اشارہ سے بھی ہو سکتی ہے، مگر اس کو وقت کی تعیین پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس کا حق ہے، کہ جب چاہے دے، البتہ اگر وہ وقت بتا دے تو پھر اس کے لیے وقت پر دینا ضروری ہوگا، اجیر خاص اگر اس متعین مدت اور وقت تک اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہا، اور وہ کسی وجہ سے کام نہ کر سکا، تو اجرت کا مستحق قرار پائے گا، اور اجیر مشترک اجرت کا مستحق اس وقت ہوگا، جب کام حسب معاہدہ پورا کرے، البتہ اگر دونوں راضی ہوں یا یہ شرط کر لی تھی، کہ اجرت پہلے مل جائے گی تو وہ مانگ سکتا ہے، اس میں حکمت یہ ہے لان العمل فی البعض غیر منتفع بہ" اس لیے کہ بسا اوقات اس کا کام ٹھیک نہیں ہوتا۔

۲۔ اجیر خاص سے گھر یا کارخانہ کی چیز کو اگر نقصان پہنچ جائے تو اس کو اس کا تاوان دینا نہیں پڑے گا، مگر اجیر مشترک کو بعض صورتوں میں تاوان دینا پڑے گا، مثلاً گھر کے ملازم سے گھڑا گلاس برتن یا کوئی ایسی چیز جس کے استعمال کی اسے اجازت ہے اچانک گر کر ٹوٹ جائے، تو اس کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں، البتہ اگر وہ ایسی چیز کا نقصان کرے، جو اس کے چارج میں نہیں ہے، یا قصداً ایسا کرے تو وہ اس

کا ضامن ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی کارخانہ کے مزدور سے اچانک ایسی مشین ٹوٹ جائے جس کو وہ چلا رہا ہے، یا غلطی سے کسی ایسی چیز کا نقصان ہو جائے، جو اس کے چارج میں ہے، تو اس پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی، البتہ اگر قصداً خراب کر دے تو اس کا ذمہ دار ہوگا اور اسے اس کا تاوان دینا ہوگا لیکن اگر اجیر مشترک سے کسی چیز کا نقصان ہوگا تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا، مثلاً اگر دھوبی سے کپڑا جل جائے، یا پھٹ جائے بشرطیکہ وہ بالکل کمزور نہ ہو، یا درزی کپڑا چھوٹا کر دے یا سنار طلب کے خلاف کوئی زیور بنا دے تو ان صورتوں میں ان سے تاوان لیا جائے گا، اور اگر وہ چیز بالکل ہی ضائع یا خراب ہو جائے، مگر اس کے عمل میں ان کو کوئی دخل نہ ہو، تو امام ابوحنیفہ کی رائے ہے، کہ ان سے تاوان نہ لیا جائے، مگر امام ابی یوسفؒ اور امام محمد کی رائے ہے، کہ تاوان لیا جائے گا، اس لیے کہ ان کے اوپر یہ ذمہ داری تھی، کہ وہ ان اموال کی حفاظت کریں، جن کو انہوا نے اپنے ذمہ اور قبضہ میں لیا ہے،

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں، کہ وہ چیز جو تلف ہوئی ہے، اجیر کے ہاتھ میں امانت تھی، اور امانت کا یہ حکم ہے کہ اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان اس پر نہیں ہے۔

اس بارے میں عاجز اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اگر معاشرہ صالح ہے، اور اس بات کا امکان کم ہو، کہ لوگ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ لوگوں کے مال کو خورد برد کریں گے، تو یقیناً ضمان نہ لیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کی طرف سے کوئی زیادتی (تعدی) نہیں پائی گی ہے، اور بغیر تعدی کے ضمان نہیں ہے، اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے "فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ" سے بھی استدلال کیا ہے، اور اگر معاشرہ صالح نہ ہو، بلکہ اس کا امکان زیادہ پایا جاتا ہو، کہ اس طرح سے اہل پیشہ گاہکوں کے

اموال ہڑپ کر جائیں گے، جیساکہ اس زمانہ میں ہے۔ تو ایسی صورت میں ضرور ضمان لیا جائے گا، چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اس پر عمل کیا تھا، حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے کہ۔ کان یضمن اجیر المشترک لاموال الناس لہ احتیاطاً

وہ لوگوں کے مال کی حفاظت کے خیال سے اجیر مشترک سے تاوان لیتے تھے،

صاحب ہدایہ کہتے ہیں، کہ قیاساً تو یہی بات درست ہے کہ ان سے ضمان نہ لیا جائے گا، مگر صاحبین نے استحساناً ضمان عائد کردی ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ:

لصیانۃ اموال الناس۔

تاکہ لوگوں کی چیزیں اور اموال ضائع نہ ہونے پائیں۔

ہدایہ کے محشی نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے، کہ:

لان الاجیر المشترک یتقبل احیانا اموالا کثیرۃ رغبۃ فی کثرۃ الاجر وقد یعجز عن قضاء الحق فلا یاخذ الا یقدر ما یقدر علی حفظہ۔

اہل پیشہ سے تاوان اس لیے لیا جائے گا کہ وہ لوگوں کا سامان زیادہ اجرت کی حرص کی وجہ سے لیتے چلے جاتے ہیں، حالانکہ اس کی حفاظت ان کے بس سے باہر ہو جاتی ہے، تو تاوان کی وجہ سے وہ اتنا ہی سامان لیں گے جتنے سامان کی وہ باقاعدہ حفاظت کر سکیں۔

مقصد یہ ہے کہ ان سے اس لیے تاوان لینا چاہیئے کہ ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو، اور وہ اپنے فائدہ کے لالچ میں دوسروں کا نقصان نہ کریں

لہ ابوبکر الکاسانی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۲۱۰،

صاحب بدائع الصنائع نے بھی یہی لکھا ہے،

غرض ائمہ کا یہ اختلاف حالات و ظروف کے اختلاف کی بنا پر ہے، اور یہ صورت آج بھی پیش آسکتی ہے،

لیکن اگر یہ نقصان عامۃ الورود طریقہ سے اور اس کی غفلت کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ کسی اچانک حادثہ سے ہو جائے، تو باتفاق ائمہ اجیر پر کوئی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی، مثلاً دھوبی یا درزی کے گھر میں آگ لگ گئی کپڑا جل گیا، مگر اس میں یہ بھی شرط ہے، کہ آگ اس کی یا اس کے گھر والوں کی وجہ سے نہ لگی ہو، مثلاً چولھے میں آگ رہ گئی، یا حقہ، سگریٹ بیڑی پی کر کسی نے آگ یا اس کا ٹکڑا چھوڑ دیا اور آگ لگ گئی تو ان صورتوں میں اس پر تاوان ہوگا، اسی طرح اگر کسی نے ہوائی جہاز یا سمندری جہاز یا ریل سے کوئی سامان بھیجا، اور اس میں آگ لگ گئی، تو اس میں بھی یہی بات دیکھی جائے گی، کہ اگر عملہ کی غلطی یا ان کی انتظام کی طرف سے غفلت کو اس میں دخل ہے تو جہاز کی کمپنی یا ریل کے محکمہ پر اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ اسلامی قانون تجارت [1] کے سلسلہ میں آئے گی۔"

۳۔ اگر مستاجر اجیر مشترک کو اجرت نہ دے تو وہ اجرت کے لیے اس کے سامان کو روک سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں فقہاء احناف نے اجیر مشترک کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک قسم کے اجیر تو ایسا کر سکتے ہیں، اور دوسری قسم کے نہیں کر سکتے۔

---

[1] یہ کتاب زیر ترتیب ہے۔

۱۔ کل صانع لعملہ اثر فی العین فلہ ان یحبس العین بعد الفراغ من عملہ[1]

ہر پیشہ ور جس کے عمل کا اثر اصل شئے پر پڑتا ہو، یعنی اس کے عمل سے اس میں کوئی تبدیلی ہو جاتی ہو تو اس کو سامان بنانے کے بعد اجرت (نہ ملنے تک) سامان کے روک لینے کا اختیار ہے۔

مثلاً سنار زیور بنا کر، لوہار انگیٹھی بنا کر، درزی کپڑا سی کر، رنگ ریز کپڑا رنگ کر دھوبی کپڑا دھو کر لایا تو جب تک مزدوری نہ ملے، ان کو یہ حق ہے، کہ وہ آپ کا سامان نہ دیں۔

۲۔ وکل صانع لیس لعملہ اثر فی العین فلیس لہ ان یحبس العین۔

ہر وہ اجیر جس کے عمل کا اثر اصل شے پر نہ پڑتا ہو، تو اجرت میں اس کو سامان روکنے کا حق نہیں ہے،

مثلاً کسی نے قلی سے سامان اُٹھوایا، تو اس کو اجرت میں سامان روکنے کا حق نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے ڈھونے سے سامان میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، اس پر نقل و حمل کے تمام ذرائع کو قیاس کیا جا سکتا ہے،

یہ رائے امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کی ہے، اجیروں کے نقطۂ نظر سے اس بارے میں امام مالک کی رائے زیادہ انسب اور مفید معلوم ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں، کہ ہر قسم کے اجیر کو خواہ اس کے عمل کا اثر اصل شے پر پڑے یا نہ پڑے، یہ حق ہے کہ وہ اپنی اجرت کی ادائیگی تک اصل چیز کو روک لے چنانچہ فرماتے ہیں،

لہم ان یحبسوا ما عملوا حتی یعطوا اجرھم۔

ان کو حق ہے کہ، اجرت کی ادائیگی تک وہ اصل کو روک لیں۔

مالکی فقہ کے مدوّن امام سحنون کہتے ہیں، کہ میں نے ابن قاسم سے پوچھا کہ "اگر

---

[1] ہدایہ جلد ۲ ص ۲۹۵ ۔ لکھنؤ

میں کسی شخص سے کہوں کہ میرا اتنا غلہ یا اتنا سامان اپنے سر پر رکھ کر یا اپنی سواری یا کشتی کے ذریعہ فلاں جگہ پہنچا دے، تو میں تم کو اتنی اجرت دوں گا، تو یہ

منعنی متاعی اوطعامی حتی یقضی حقہ ۔

(یا اس کو حق ہے، کہ وہ میرا سامان یا غلہ اجرت ملنے کے وقت تک روک لے؟

ابن قاسم نے کہا کہ امام مالک نے فرمایا ہے، ذلك لہ (ہاں اس کو اس کا حق ہے) بلکہ یہاں تک فرمایا:

وان فلس رب المتاع کان ھذا الحمال احق بما فی یدیہ من الغرماء حتی یقضی حقہ[1]

اگر سامان والے کے پاس پیسہ موجود نہ ہو تو بھی سامان لے جانے والے کو قرض دینے والے سے زیادہ حق ہے، کہ جب تک اس کی اُجرت نہ مل جائے، اس کے سامان کو وہ بطور ضمانت رکھ لے، اور وہ جب تک نہ ادا کرے گا گویا وہ اس کا مقروض ہوگا،

عاجز کے نزدیک امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کی رائے ایک اچھے معاشرہ کے لیے اخلاقی حیثیت سے بالکل صحیح ہے، مگر تمدنی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے امام مالک کی رائے زیادہ صحیح اور قابل عمل ہے، اگر اجیروں کو یہ حق نہ دیا جائے تو ان پر بڑا ظلم ہوگا، اور ان کی بڑی حق تلفی ہوگی، خاص طور سے آج کے حالات میں

محنت کش جانوروں کے حقوق

اسلام نے محنت کش انسانوں ہی کے نہیں

---

[1] المدونۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۴۱۳ ۔

بلکہ محنت کش جانوروں تک کے حقوق کا تحفظ کیا ہے، اس لیے دنیا کے کسی مذہبی یا سیاسی دستور میں محنت کش جانوروں کے حقوق کا کوئی ایسا مکمل قانون موجود نہیں ہے، جس میں ان کے حقوق کی پوری ضمانت وحفاظت کی گئی ہو، اگر کہیں قانونی طور پر بعض جانوروں کی حفاظت بھی کی گئی ہے، تو اس کا تعلق محض جذبات وروایات یا محض مادی منفعتوں سے ہے، مگر اس حیثیت سے ان کے حقوق متعین نہیں کیے گیے، ہیں، کہ وہ بھی خدا کی ایک بے زبان مخلوق ہیں، اس لیے ان کے ساتھ بھی انسان کو رحم وکرم کا معاملہ کرنا چاہیئے، ضرورت کے لیے ان سے کام لینا اور فائدہ اٹھانا تو صحیح ہے، مگر ان پر ظلم وستم کرنا، ان کو آرام نہ پہنچانا اخلاق وقانون دونوں لحاظ سے مجرمانہ فعل ہے

قرآن وحدیث میں یوں تو عام جانوروں کے حقوق کا ذکر ہے، خواہ چرند ہوں یا پرند، مگر موضوع کی مناسبت سے یہاں محض محنت کش جانوروں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے،

اسلام نے جانوروں سے ہر جائز فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، ان سے باربرداری، سواری، کھیتی باڑی کا کام لیا جاسکتا ہے، ان کا دودھ پیا جاسکتا ہے، ان کے بال، چمڑے، گوشت، ہڈی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، قرآن نے ان فوائد کے ساتھ ان کو عزت اور زینت کا سبب بھی قرار دیا ہے، مثلاً

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (النحل: ۵تا۸

اس نے چوپایوں کو پیدا کیا، جس میں تمہارے لئے جاڑے سے

بچنے کا سامان (اون) ہے، اور بہت سے دوسرے فوائد ہیں ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو، ان کی وجہ سے تمہیں رونق حاصل ہوتی ہے، خاص طور سے جب صبح کے وقت تم چرانے کے لیئے لے جاتے ہو، اور شام کے وقت جب تم چرا کر واپس گھر آتے ہو، اور وہ تمہارے بوجھ ایسے مقامات تک پہنچاتے ہیں، جہاں تم بڑی مشقتوں کے ساتھ پہنچ سکتے تھے، واقعی تمہارا پروردگار بڑی مہربانی اور شفقت والا ہے، اور اس نے گھوڑے، خچر، گدھے پیدا کیے ہیں، تاکہ تم ان پر سوار بھی ہو، اور ان سے تمہاری زینت و آرائش ہو، اور ان کے علاوہ تمہارے لیے (نقل و حمل کے) وہ اسباب و ذرائع پیدا کرے گا، جن کو تم جانتے ہی نہیں دوسری جگہ ہے،

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ [1]

کیا وہ لوگ غور نہیں کرتے، کہ ہم نے اپنے ہاتھ سے جو چیزیں بنائی ہیں ان میں چوپائے ہیں، تو ان کے لوگ مالک بن جاتے ہیں، حالانکہ ان چوپایوں کو ہم ہی نے ان کا تابعدار بنایا ہے، تو ان میں سے بعض پر یہ سوار ہوتے ہیں اور بعض کو کھاتے ہیں اور ان کے اندر بہت سے فائدے ہیں، اور ان کے ذریعہ کھانے پینے کا سامان ملتا ہے، پھر بھی وہ شکر نہیں کرتے

ان آیات کے علاوہ قرآن مجید میں بے شمار آیات ہیں، جن میں جانوروں سے فائدہ اٹھانے کا ذکر ہے، ان آیات میں جہاں ان جانوروں سے کام لینے اور فائدہ حاصل کرنے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا

---

[1] سورہ یٰس: ۷۱ تا ۷۳

گیا ہے، کہ جن جانوروں کے تم مالک بن بیٹھے ہو حقیقتاً وہ تمہاری ملک نہیں، بلکہ خدا کی ملک ہیں، اس لیے کہ ان کی تخلیق اس نے کی ہے، اور تمہارا مالک بن بیٹھنا بھی اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، اگر وہ ان کو تمہارا تابعدار نہ بناتا تو ایک ضعیف البنیان انسان کی یہ مجال تھی، کہ وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ اور قوی ہیکل جانوروں کو اپنے قبضہ میں کر لیتا یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی اور شفقت ہے، ربکم لرءوف الرحیم۔

ان آیات میں قرآن نے دو حقیقتیں واضح کی ہیں، ایک یہ کہ جو جانور تمہاری ملک میں آگئے ہیں، وہ خدا کی مہربانی اور عنایت ہے اس لیئے تم کو ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے، جو ایک امین امانت کے ساتھ کرتا ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سواری پر سوار ہوتے وقت یہ دعا پڑھا کرو، سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین تاکہ تمہارے ذہن میں خدا کے اس احسان کا احساس تازہ رہے،

دوسری یہ کہ جس طرح تمہاری تخلیق خدا نے کی ہے، اسی طرح ان کی تخلیق بھی اسی کی قدرت کی کرم نوازی ہے، اس لیئے مخلوق خدا ہونے کی حیثیت سے تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ۔

زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور۔

يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (الانعام: ۳۸)

ہوا میں اُڑنے والا ہر پرندہ، جو اپنے دونوں بازوؤں سے اُڑتا ہے تمہاری ہی طرح ایک ایک اُمت ہیں،

قرآن کی اس آیت میں محض ایک اخلاقی تعلیم ہی نہیں دی گئی ہے، بلکہ یہ ایک قانونی دفعہ بھی ہے،

ایک بار حضرت عبیداللہؓ حضرت عبداللہؓ بن بشرؓ کی خدمت میں آئے، اور پوچھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، اور اس کو کوڑا مارتا ہے، اس کے متعلق آپ کو کوئی ارشاد نبوی معلوم ہے، بولے نہیں، اندر سے ایک خاتون بولیں کہ خدا خود کہتا ہے، لے

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ، یعنی ایسے موقع پر ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے، وہی اس جانور کے ساتھ بھی رکھنا چاہیئے۔

اس آیت کی توضیح ایک حدیث نبوی سے بھی ہوتی ہے، آپ نے فرمایا کہ

لولا الکلاب امة من الامم لامرت بقتلها ۔ ۲

اگر کتے امتوں میں سے ایک امت نہ ہوتے، تو میں ان کے قتل کا حکم دے دیتا۔

اس طرح اسلام میں بلا وجہ کتے تک کو مار ڈالنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ وہ بھی خدا کی مخلوق ہیں، اور ہماری طرح ایک امت ہیں بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے خدا نے ایک شخص کو بخش دیا، کسی نے آپ سے پوچھا کہ جانوروں کے ساتھ بھی سلوک کرنے میں اجر و ثواب ہے، فرمایا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے (فی کل ذی کبد رطبة) تو پھر ان جانوروں کا جن کو خدا نے انسان کی زینت اور رونق اور اس کے بے شمار فائدے کے لیے پیدا کیا ہے، کتنا حق ہوگا، اور ان کے ساتھ سلوک کرنے میں کیا اجر نہ ہوگا۔

لے اسد الغابہ تذکرہ عبداللہ بن بشر ۲ے تفسیر خازن ج ۲ ص ۱۰۹ بحوالہ ترمذی ابو داؤد۔

مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان محنت کش جانوروں کے جن سے ہم کسی طرح کا کام لیتے ہیں، یا ان سے غذا یا لباس کا فائدہ اٹھاتے ہیں، حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے ہیں،

۱- جو جانور جس کام کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، ان سے وہی کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ ایک شخص بیل پر سوار ہوا، اور اس نے اس کو مارا تو بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں [۱] صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں پھر آپ نے فرمایا کہ جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے ان کو تمہارا فرمان بردار صرف اس لیے بنایا ہے، کہ وہ تم کو ایسے مقامات پر پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے ہو۔

اس حدیث کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ بلا ضرورت سواری پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ جانور کو بلا ضرورت تکلیف ہوتی ہے، دوسرے جتنی دیر سفر کرنا ہے اتنی ہی دیر اس کی پیٹھ کو استعمال کیا جائے اس کے بعد اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو ایک جاندار کے ساتھ کیا جاتا ہے، سواری لکڑی پتھر کا تخت اور چبوترہ نہیں ہے، کہ اس کو استعمال کرنے کے بعد پھر اس کی غذا اور دیکھ بھال کی ضرورت نہیں رہی منبر بنانے کا مطلب یہی ہے۔

---

[۱] بخاری باب استعمال البقر للحراثۃ اور مسند ج ۲ ص ۲۴۵ اس حدیث سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ گھوڑے اور بیل کو مطلقاً دوسرے کام میں نہ لانا چاہیئے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، آپ کے فرمانے کا مقصود یہ ہے کہ خالق فطرت نے جس کام کے لیے ان کو پیدا کیا ہے، یا عام طور پر ان سے جو کام لیے جاتے ہیں، وہی کام لیے جائیں، اس کے خلاف کرنے سے نظام تمدن میں خرابی پیدا ہوگی۔

(۲) . . س طرح آدمی کام کرنے کے بعد تھک جاتا ہے، اور اس کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح حیوان بھی تھکتے ہیں، اور ان کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے، آدمی کے پاس زبان ہے، اس لیے وہ اس کا اظہار کر دیتا ہے، مگر جانور بے زبان ہیں، اس لیے ان کے آرام و آسائش کا خود خیال رکھنا چاہیئے، ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو ان پر سوار ہو تو وہ اچھی حالت میں ہوں یعنی سوار ہونے سے پہلے انہیں اچھی طرح کھلا پلا لو۔ یہ بھی دیکھ لو کہ وہ بیمار تو نہیں ہیں ان کے اعضاء صاف ستھرے ہیں، یا نہیں۔ یہ محض ایک اخلاقی تعلیم نہیں، بلکہ ایک قانونی دفعہ ہے۔ اس لیے کہ آپ نے حکماً فرمایا ہے کہ۔

فارکبوها صالحۃً۔ [1]

ان پر اچھی حالت میں سواری کرو۔

ایک انصاری اپنے اونٹ سے کام زیادہ لیتے تھے، اور چارہ کا خیال کم رکھتے تھے آپ نے ان کو بلا کر یہ تنبیہ فرمائی،

افلا تتقی اللہ فی ھذہ البھیمۃ التی ملکک اللہ ایاہا انہ تجیعہ و تدئبہ۔

اس جانور کے بارے میں خدا سے ڈرتے نہیں کہ اس نے اپنے فضل سے اس کو تمہارا محکوم بنا دیا ہے، اس سے کام زیادہ لیتے ہو، اور بھوکا رکھتے ہو۔

آپ نے فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو، تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی اور شادابی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں (بنجر علاقہ میں) سفر

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجهاد: باب الوقوف علی الدابۃ

کرو۔ تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ [ا] تاکہ راستہ میں اسے چارہ کی کمی کی جو تکلیف ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پا جائے،

حضرت انس بن مالکؓ صحابہ کا اسوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب منزل پر اترتے تھے، تو نماز پڑھنے سے پہلے سواریوں کا کجاوہ کھول کر ان کو باندھ دیتے تھے، اس اسوہ کی روشنی میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اپنے کھانے سے پہلے سواریوں کے کھانے کا انتظام کرنا چاہیئے، [۲]

(۳) جانوروں کو ہلکی پھلکی سزا دی جا سکتی ہے، مگر منہ پر مارنے اور ان کو داغ دینے کی ممانعت ہے، ایسے شخص کو آپ نے ملعون قرار دیا ہے [۳]،
البتہ اگر کسی مذہبی یا تمدنی مصلحت کے تحت داغنے کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ہے۔

(۴) جانوروں کو باہم لڑایا نہ جائے، آپ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

(۵) جس طرح انسان کو گالی دینا اور ملعون یا مردود قرار دینا منع ہے، اسی طرح جانوروں کو بھی ملعون، مردود نہ کہنا چاہیئے۔
ایک بار آپ کسی سفر میں تھے، کسی عورت نے اپنے جانور کو لعنت ملامت کی، آپ نے سنا تو فرمایا کہ یہ لعنت کس نے کی ہے، لوگوں نے بتلایا کہ فلاں عورت نے اپنی سواری کو لعنت کی ہے، آپ نے فرمایا کہ سواری کا کجاوہ اتار دو، خود اس نے لعنت کا کام کیا ہے۔ ... ... ان احکام کی حیثیت محض اخلاقی تعلیم کی نہیں، بلکہ قانونی بھی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں جو طرز خطاب اور

---

[۱] سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی: جلد ۵: ص ۳۴۹ [۲] معالم السنن

طریقۂ تعبیر اختیار فرمایا ہے اس سے ان کی اخلاقی حیثیت کے ساتھ قانونی حیثیت بھی واضح ہوتی ہے، کیونکہ ان ہدایات میں ہر موقع پر امر کا صیغہ یعنی حکم دینے والا لفظ استعمال ہوا ہے، جو اس کی قانونی حیثیت کو واضح کرتا ہے، قانونی حیثیت کا مطلب یہ ہے، کہ اس بارے میں اگر جانوروں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تو حکومت اس کا سدِّباب کرے۔

اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے کہ حکومت بطور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جانوروں کے مالکوں سے ان کے لئے معقول چارے کا انتظام کرائے اور جانوروں کو آرام پہنچانے کا حکم دے اور کہے کہ ان پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔

مگر ائمۂ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ متفقہ طور پر فرماتے ہیں

لہ ان یجبر علی نفقتہا او بیعہا۔

حاکم اس کو مجبور کرے کہ وہ اس کو چارہ دے، یا پھر بیچ ڈالے۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ:

انہ یمنع من حملہا ان لا تطیق۔

اگر کوئی شخص جانور سے اس کی استطاعت سے زیادہ کام لیتا یا اس پر بوجھ لادتا ہے، تو حاکم کو اس سے روک دینا چاہیئے۔

اس کی قانونی حیثیت پر ائمۂ فقہ کے اس متفقہ اصول سے بھی روشنی پڑتی ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی جانور پر سوار ہو کر جا رہا ہے، اور وہ جانور راستہ میں کوئی نقصان کر دے، اور وہ نقصان اس کے پیر یا دم کے ذریعہ نہ ہوا ہو، تو اس کی ذمہ داری سوار پر ہوگی، ظاہر ہے کہ جب جانور کا مالک اس کے اس نقصان کا ذمہ دار ہے، جو اس کے کسی حصّہ

کے ذریعہ ہو، تو پھر خود جانور پر زیادتی یا۔ اس کے جسم و جان کو جو نقصان پہنچے گا، اس کا یہ ذمہ دار کیوں نہ قرار دیا جائے، واللہ اعلم بالصواب۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

تمام شد

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ
فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ
وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ
الْأُمُورِ

الحج ٤١